بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تحقیقی نقوش

(تحقیقی اور تنقیدی مضامین)

ڈاکٹر محمد علی اثر

اشاعت اول ـــــ ۱۹۹۳ء
مطبع ـــــ تمل ناڈو اُردو پبلیکیشنز ۔ مدراس ۲
تعداد ـــــ ۷۸۶
قیمت ـــــ ۷۵ روپے
سرورق ـــــ قیصر سرمست
ناشر ـــــ محمد علی اثر
کتابت ـــــ محمد اقبال خوشنویس

زیرِ اہتمام ـــــ علیم صبا نویدی

TEHQEEQI NUQOOSH

Dr. MOHD. ALI ASAR

FIRST EDITION 1993
PRICE Rs. 75=00

ملنے کے پتے

کاشانۂ اثر 20-4-226/9 محبوب چوک، حیدرآباد ۲

علیم صبا نویدی، 26 امیر النساء بیگم اسٹریٹ، ماونٹ روڈ مدراس ۲

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوز کوچہ پنڈت ۔ گلی عزیز الدین وکیل، لال کنواں دہلی

مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ ۔ دہلی ۔ بمبئی ۔ علی گڈھ

حسامی بک ڈپو ۔ چارکمان ۔ حیدرآباد

اسٹوڈنٹس بک ہاوز ۔ چارمینار، حیدرآباد

مکتبہ رفاہِ عام ۔ درگاہ حضرت خواجہ بندہ نواز ۔ گلبرگہ

اس کتاب کی اشاعت میں آندھرا پردیش اُردو اکیڈیمی کی جزوی مالی اعانت شامل ہے

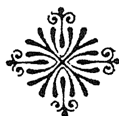
اِنتساب



اپنی شریکِ زندگی
راحت سلطانہ
اور بچوں
کہکشاں، فراز، ثریا، ناہید اور سہیل
کے نام

اثرؔ

فہرست مضامین



تعارف

ڈاکٹر محمد علی اثر ہندوپاک کے گنے چنے ماہرینِ دکنیات میں سے ایک ہیں۔ وہ اُردو کے ایک ذہین اُستاد، محقق، نقاد اور شاعر ہیں۔ ان میں وہ تمام خوبیاں جمع ہوگئی ہیں جو ایک اچھے اور بڑے محقق کے ہاں ملتی ہیں۔ وہ بڑی خاموشی، لگن اور انہماک سے اپنے کام میں لگے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دکنی شعروادب کے مختلف پہلوؤں پر وہ اب تک کئی وقیع اور اہم کتابیں لکھ چکے ہیں۔ جن میں "غواصی۔ شخصیت اور فن"۔ "دبستان گولکنڈہ"۔ "دکنی اور دکنیات"۔ "دکنی غزل کی نشوونما" "دکنی کی تین مثنویاں" اور "دکنی شاعری۔ تحقیق و تنقید" کافی مقبول ہوچکی ہیں۔ زیرنظر کتاب "تحقیقی نقوش" بھی دکنیات میں ایک اہم اور قابلِ قدر اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

ڈاکٹر محمد علی اثر نے اس کتاب میں دکنی کے بعض ایسے شعرا کی تخلیقات پر روشنی ڈالی ہے۔ جن پر اب تک برائے نام لکھا گیا تھا۔ اور جو کچھ لکھا گیا تھا اس سے اِن کی ادبی قدر وقیمت نمایاں نہیں ہو رہی تھی۔ فراقی دہلوری، جیتونی گجراتی

اور فدوی اورنگ آبادی ایسے ہی شعرا ہیں، جن کی ادبی اہمیت کو ڈاکٹر اثر نے سب سے پہلے پوری طرح اجاگر کیا ہے۔

دکنی شاعر سید محمد فراقی کے بارے میں گو مختلف محققین نے چیدہ چیدہ معلومات مہیا کی ہیں لیکن اثر صاحب نے اب تک ان پر جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کا اس قدر تحقیق کے ساتھ احاطہ کیا ہے کہ اب فراقی کے بارے میں شاید ہی کوئی ایسا ماخذ باقی رہا ہو۔ جو اس کے بارے میں مزید روشنی ڈال سکے۔

جیونی گجراتی بھی ایسے شاعر ہیں۔ جن کے بارے میں ہماری معلومات بڑی محدود ہیں۔ محمد علی اثر کی تحقیق سے پہلے یہ ایک گمنام شاعر کی حیثیت رکھتا تھا۔ انھوں نے پہلی بار اس کے بارے میں اور اس کے غیر مطبوعہ قصیدہ کے بارے میں اہم ترین معلومات فراہم کی ہیں۔

فدوی اورنگ آبادی پر انھوں نے جو مقالہ لکھا ہے۔ وہ ان کی تحقیقی کدو کاوش کی روشن مثال ہے۔ اثر صاحب نے پہلے تو اردو میں فدوی نام کے جتنے بھی شعرا گذرے ہیں، ان کی تعداد کو متعین کیا ہے۔ فدوی نام کے کوئی آٹھ دس شاعر گذرے ہیں۔ ان میں سے فدوی خاں فدوی کا تعلق دکن سے ہے۔ پھر انھوں نے فدوی کے غیر مطبوعہ کلام کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ اور آخر میں "دیوان فدوی" کے مخطوطے سے اس کی غزلوں کا ایک بسیط انتخاب بھی پیش کیا ہے، جس کی وجہ سے اس مقالے کی اہمیت میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔

"قطب شاہی عہد میں اردو غزل کا نشوونما" کے موضوع پر محمد علی اثر کا مقالہ خاصا جامع ہے۔ دکنی غزل ان کا خصوصی میدان ہے۔ اس سے پہلے اس دور کی غزل گوئی کا ایسا بھرپور تحقیقی اور تنقیدی جائزہ نہیں لیا گیا تھا۔

"ڈاکٹر جمیل جالبی اور دکنی ادب کی تحقیق" بھی محمد علی اثرؔ کی دکنی ادب پر گہری نظر کی ایک روشن مثال ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے دکنی ادب پر جو تحقیقی کام کیا ہے۔ اس کا اعتراف اور اس کی تحسین اب تک خاطر خواہ نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اس مقالے کے ذریعے اس کی پوری طرح تلافی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر اثر نے جہاں جالبی صاحب کے اعلیٰ درجے کی تحقیقی کدو کاوش کو خراج تحسین پیش کیا ہے وہیں، جہاں بھی ڈاکٹر جالبی کی نظر چوکی ہے۔ اس کا بھی محاسبہ کیا ہے۔ یہ بات بجائے خود اثر صاحب کے صاحبِ نظر ہونے کی دلیل ہے۔

"نئی تحریریں۔ ایک مطالعہ" ڈاکٹر عبدالستار دلوی کی کتاب کا تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ ہے۔ اس کتاب کی اہمیت کو محمد علی اثر نے سب سے پہلے پوری طرح نمایاں کیا ہے۔

"ولی کی شمالی ہندوستان کو دین" میں ڈاکٹر محمد علی اثر نے ولی دکنی کے ادبی اور لسانی اجتہاد کا مفصّل جائزہ لیتے ہوئے، شمالی ہند کے شاعروں پر ولی کے اثرات کو نمایاں کیا ہے۔ اس سلسلے میں ولی دکنی کے بارے میں جو مواد بکھری ہوئی صورت میں ملتا ہے اس کو محمد علی اثر نے اس خوبی کے ساتھ اکٹھا کیا ہے کہ اس سے پہلے اس کی مثال نہیں ملتی۔ مضمون کے آخر میں انھوں نے شمالی ہند کے دورِ اوّل کے شاعروں کی ایسی غزلوں کی نشاندہی بھی کی ہے جو ولی کی زمینوں میں لکھی گئی ہیں۔

محمد قلی قطب شاہ اور ملک الشعرا اسداللہ وجہی کے بارے میں مرتب کی گئی کتابیات دکنی ادب کی تحقیق کے سلسلے میں حوالے کا مواد فراہم کرتی ہیں۔ ڈاکٹر اثر نے وجہی اور محمد قلی پر آج تک جو بھی کام ہوا ہے، اس کا احاطہ بڑی

دیدہ ریزی کے ساتھ کیا ہے۔ یہ دونوں مقالے اثر کی غیر معمولی تحقیقی ژرف نگاہی کی روشن دلیل ہیں۔

اس کتاب میں دکنیات سے ہٹ کر بھی ایک مقالہ "نظیر کے واقعاتِ حیات" ملتا ہے۔ یہ مختصر مقالہ بھی اتنا جامع ہے کہ آج تک نظیر اکبرآبادی کی زندگی پر جتنا بھی تحقیقی کام ہوا ہے، اس کا احاطہ اس میں ہو گیا ہے۔

ڈاکٹر محمد علی اثر کا یہ مجموعۂ مضامین "تحقیقی نقوش" دکنی شعر و ادب کے بارے میں ایسے گہرے تحقیقی نقوش مرتسم کرتا ہے، جو ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے اور ان کا مطالعہ ہوتا رہے گا۔

یوسف سرمست

(ڈاکٹر یوسف شریف الدین)
پروفیسر و صدر شعبۂ اردو
عثمانیہ یونیورسٹی - حیدرآباد

پیش لفظ

حیدرآباد کے محققوں میں ڈاکٹر حفیظ قتیل، جناب اکبرالدین صدیقی، ڈاکٹر غلام عمر خاں، ڈاکٹر حسینی شاہد اور ڈاکٹر سیدہ جعفر کے بعد کی نسل میں ڈاکٹر محمد علی اثر سب سے زیادہ نمایاں ہیں ان کی کتاب "دکنی غزل کی نشوونما" اپنے موضوع پر ایک معتبر اور پُرمغز مقالہ ہے۔ اس کے بعد بھی وہ زوالِ صحت کے باوجود دکنی اور دکنیات پر کتابیں تصنیف کرتے رہتے ہیں۔ ان کا تازہ ترین کارنامہ زیرِ نظر مجموعۂ مضامین "تحقیقی نقوش" ہے انھوں نے مجھے دس مضامین کا مسودہ دکھایا ہے۔ میں کامل یقین سے تو نہیں کہہ سکتا لیکن گمان غالب یہی ہے کہ یہ مجموعہ انہیں دس مضامین پر مشتمل ہے۔ میں نے ان سے تجویز کی کہ ہر مضمون کے آخر میں صراحت کریں کہ یہ پہلی بار کہاں شائع ہوا اور اگر فرمائشی ہے تو یہ بتادیں کہ کس تقریب کے لیے لکھا گیا۔ مجھے خوشی ہے کہ انھوں نے میری گزارش قبول کر لی۔

میں ان مضامین کے بارے میں اپنے مختصر مشاہدات پیش کرتا ہوں۔ چوں کہ میرے سامنے مضامین کے مسودے منتشر صورت میں ہیں اس لیے ممکن ہے کہ میرے مشاہدات کی

ترتیب اور کتاب میں مضامین کی ترتیب میں پوری مطابقت نہ ہو۔

پہلا مضمون "جنونی گجراتی کا ایک غیر مطبوعہ قصیدہ" ہے۔ اس نے یہ قصیدہ ۲۴ ربیع الاوّل ۱۱۰۲ھ (دسمبر ۱۶۹۰ء) کو مکمل کیا۔ اس کا موضوع پیغمبر اسلام کا ایک معجزہ ہے۔ جنونی بالکل گمنام شاعر ہے۔ اس کے قصیدے میں کوئی شاعرانہ حسن بھی نہیں۔ سیدھی سادی بیانیہ نظم ہے۔ دراصل اس موضوع کے لیے مثنوی کی صنف زیادہ بہتر رہتی بہ نسبت بحر رجز سالم کے قصیدے کے۔

جب ہمارے محققین مجہول الاسم غیر اہم ادیبوں کی غیر مطبوعہ تخلیقات پر مضمون لکھتے ہیں تو میرے دل میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ کیا یہ تخلیق ادبی اعتبار سے اس قابل ہے کہ قارئین کو اس کی طرف متوجہ ہونے کی دعوت دی جائے۔ ہر ریسرچ لائبریری میں شمال و دکن کے غیر اہم شعرا کی غیر مطبوعہ داستانیں، مثنویاں، دیوان اور کلیات بھرے پڑے ہیں۔ قارئین کے محدود وقت کو ان کی نذر کیا جائے کہ نہیں۔ میری رائے میں زیادہ قدیم ادیبوں کی تخلیقات کو ضرور منظر عام پر لانا چاہیے خواہ وہ ادبی اعتبار سے کم مایہ ہوں۔ ان کی اشاعت سے ہماری قدیم ادبی تاریخ متموّل ہوتی ہے۔ دورِ متوسط کی انہیں غیر مطبوعہ تخلیقات کو شائع کرنا چاہیے جو ادبی محاسن کی امین ہیں۔

سوال یہ ہے کہ انیسویں بلکہ اٹھارویں صدی کے غیر مشہور ادیبوں کی جو غیر مطبوعہ کتابیں ملتی ہیں۔ کیا وہ ایک گوشۂ چشمے کے لائق بھی نہیں۔ ان ادیبوں نے جگر خون کر کے ایک دیوان، ایک مثنوی یا ایک داستان تصنیف کی۔ ان پر ایک مختصر تعارفی مضمون لکھ دیا جائے تو کیا یہ ایسا گناہ ہے جس سے مجھ جیسا مبصّر احتساب کرے۔ نہیں۔ میرا خیال ہے کہ علاقائی جائزے یا اس صنف ادب پر مقالے میں جامعیت کی خاطر ان کا بھی تذکرہ کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس تنقیدی توازن کے ساتھ کہ اپنی دریافت کو یہ اہمیت نہ دی جائے گویا قارئین نے

اب تک اس سے تغافل کر کے کوئی خطائے عظیم کی ہے۔

جنونی پر مضمون کا یہی جواز ہے کہ وہ سترہویں صدی عیسوی کے قدیم دور کا شاعر ہے۔ وہ عربی، ترکی اور فارسی زبان کو اہم گردانتا ہے اور ہندی زبان کو شاید ان سے فروتر۔ اس زبان میں قصیدہ لکھنے کا یہ جواز (معذرت ؟) پیش کرتا ہے کہ جو فارسی نہیں جانتے، اسے سمجھ سکیں۔ اس قصیدے کی ایک لسانی اہمیت بھی ہے کہ اس میں دولسانی ریختوں کی طرح بعض پورے مصرعے فارسی میں ہیں، بعض مصرعوں میں فارسی کے فعل اور حرف باندھ دیے گئے ہیں۔ مثلاً

فارسی بات رشکر ۔ درہندی زبان ۔ راوی روایت می کند ۔ انا ز دہام مردمان (کذا)

ع لاگے اچھل ڈالوں سیتی ہر یک کہ گفتم [یک ثمر]

ع از پیش خلّاقِ جلیل سوئیش یہ کردہ باز سر

ع یو دست کر دایں [را] ختم درشہر گجرات اے پسر

دوسرا مضمون حافظ سید محمد فراقی ہے۔ فراقی کی اہمیت یہ ہے کہ وہ ولی کا دوست تھا اور ولی نے اس کے ایک مصرع پر گرہ لگائی تھی

ولی مصرع فراقی کا پڑھل تب ٹک وہ ظالم ؎ کمر سوں کھینچتا خنجر، چڑھاتا آستیں آوے

فراقی نے شمالی ہند کا سفر بھی کیا تھا اور کئی شمالی تذکروں میں اس کا احوال ملتا ہے۔ اس نے تقریباً چار ہزار اشعار کی ایک مثنوی مراۃ الحشر لکھی۔ ڈاکٹر اثر نے اس مثنوی کا مفصّل جائزہ لیا ہے۔ فراقی کی چند غزلیں بھی ملتی ہیں۔ ان کا بھی تعارف کرایا ہے۔ اس کی سوانح اور خاندان کے بارے میں بھی ضروری معلومات فراہم کی ہیں۔ اس طرح یہ مضمون خاصا جامع ہو گیا ہے۔

اگلا مضمون ' قدوی اورنگ آبادی اور اس کا غیر مطبوعہ کلام ' ہے۔ یہ بھی دکنی کا ایک گم نام، لیکن خوش گو شاعر ہے۔ مضمون کی ابتدا میں اثر قدوی تخلص کے سات شاعروں

کا ذکر کرتے ہیں لیکن دمِ تحریر ان میں مکند لال فدوی شامل نہیں جس کی سودا نے ہجو کہی۔
یہ بعد میں مسلمان ہوگیا تھا لیکن مجھے اس کا اسلامی نام معلوم نہیں۔ امید کرتا ہوں کہ ڈاکٹر اثر اس کا اضافہ کر کے "فدویوں" کی تعداد آٹھ کریں گے۔ ڈاکٹر محمد علی اثر کا موضوع دکنی شاعر فدوی ہے۔
یہ بارہویں صدی ہجری کا شاعر ہے۔ اثر مطلع کرتے ہیں کہ وہ اگر ولی کا ہم عصر نہیں تو سراج اور داؤد اورنگ آبادی کا معاصر ضرور رہا ہوگا۔ ڈاکٹر اثر کی رائے میں "چھوٹی بحروں میں فدوی کی غزلیں ایک طرف غواصی اور ولی کی ہم پلہ معلوم ہوتی ہیں تو دوسری طرف ان غزلوں کے مطالعہ سے میر تقی میر کی یاد تازہ ہو جاتی ہے"

اس کے آگے انھوں نے فدوی کی غزلوں کے جو اشعار نمونتہً پیش کئے ہیں، ان میں معرکے کے ایسے اشعار بھی ہیں۔

خود نمائی ہے ذات کا پردا	خامشی ہے صفات کا پردا
مکھ اپر کیس یوں دسے دھن کے	دن پہ غالب ہے رات کا پردا
نس کوں کس کوں دکھانہ اپیں صنم	چاند کا اعتبار جاتا ہے
شیشۂ چک میں گل بدن کے سبب	ہے لبالب گلاب انکھیاں میں
جو دیکھیا ہے چشم تیری نیم خواب	خواب میں نیئں تا قیں لیتا خواب کا

ایسے شاعر کے دیوان کا تعارف نہ صرف دکنیات کے شائقین کی، بلکہ اردو ادب کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے تمام اہلِ نظر کی دلچسپی کا موجب ہوگا۔

چوتھا مضمون "قطب شاہی دور میں اردو غزل کا نشوونما" ہے۔ میں نشوونما کو مونث بولتا ہوں۔ لغت میں دیکھا تو یہ لفظ مذکر و مونث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ خود ڈاکٹر اثر نے اپنے مقالے کا نام "دکنی غزل کی نشوونما" رکھا ہے۔ بہرحال مضمون بہت مفصل اور بھرپور ہے۔
اس موضوع پر ان کی پوری کتاب موجود ہے۔ زیرِ نظر مضمون میں قطب شاہی دور کے مشاہیر

غزل گویوں پر توجہ مرکوز رکھی ہے۔ ابتدائً فیروز اور محمود استاذ کی غزلوں کا ذکر ہے۔ اس کے بعد تفصیل سے محمد قلی قطب شاہ، وجہی، غواصی اور عبداللہ قطب شاہ کی غزلوں کا تنقیدی تعارف پیش کیا ہے۔ میرے لیے ذیل کی معلومات چونکانے والی ہیں۔

"عبداللہ قطب شاہ کا مکمل دیوان ہنوز دریافت نہیں ہوا ہے۔ اس کا موجودہ دیوان ۱۱۸ صفحات پر مشتمل ہے جس میں صرف ردیف 'ث' تک ۹۷ غزلیں اور ایک مرثیہ شامل ہے۔"

ڈاکٹر اثر کے مقالے 'دکنی غزل کی نشو و نما' میں عبداللہ کا ذکر تفصیل سے ہے لیکن وہاں یہ نہیں بتایا گیا کہ اس کا دیوان نامکمل ہے اور محض ث کی ردیف تک ہے۔ اس سے قطعِ نظر اس مضمون سے قطب شاہی عہد کی غزل کے بارے میں تمام ضروری معلومات مل جاتی ہیں۔

پانچواں مضمون 'ڈاکٹر جمیل جالبی اور دکنی ادب کی تحقیق' ہے۔ دکنی ادب کے غیر دکنی محققین میں مولوی عبدالحق، ڈاکٹر نذیر احمد، ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی اور ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے بعد ڈاکٹر جمیل جالبی اہم ترین نام ہے۔ دکنیات میں ان کی دین کسی محقق سے کم نہیں۔ انھوں نے دکنیات کی تدوین بھی کی، ادبی تاریخ بھی لکھی اور 'قدیم اردو کی لغت' بھی ترتیب دی جو دکنی ہی کی فرہنگ ہے۔ اثر نے ڈاکٹر جالبی کی دکنی ادب سے متعلق کتابوں کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ مجھ کم سواد نے بھی ڈاکٹر سیدہ جعفر کی شرکت میں "اردو ادب کی تاریخ ۱۷۰۰ء تک" لکھی ہے اور یہ زیادہ تر دکنی ہی کی تاریخ ہے۔ یہ پرسوں سے ترقی اردو بیورو، دہلی میں زیرِ طبع ہے شائع ہو تو اہلِ نظر بتائیں کہ میں نے دکنی تحقیق میں کیا کیا ٹھوکریں کھائی ہیں۔ محمد علی اثر نے اس مضمون میں ڈاکٹر جمیل جالبی کی دو تدوینوں: دیوانِ حسن شوقی اور دیوانِ نصرتی کی بعض قراتوں کی تصحیح کی ہے اور ان سے ہٹ کر جالبی صاحب کی دکنی تحقیق کو مناسب خراجِ عقیدت بھی پیش کیا ہے۔

چھٹا مضمون "نئی تحریریں۔ ایک مطالعہ" دکنیات سے متعلق نہیں۔ 'نئی تحریریں' ڈاکٹر عبدالستار دلوی کے مجموعۂ مضامین کا نام ہے۔ اس میں ایک مضمون "شاہ تراب چشتی،

نظیر اکبر آبادی کا پیش رو" کسی حد تک دکنیات کے ضمن میں آسکتا ہے بقیہ کوئی مضمون دکنیات کے موضوع پر نہیں۔

ساتواں مضمون " ولی کی شمالی ہندوستان کو دین " اچھوتا موضوع ہے۔ اس کی اہم ترین تحقیق یہ ہے کہ شمالی ہند کے قدیم شعرا نے ولی کی زمینوں میں کتنی غزلیں لکھیں۔ مضمون مختصر لیکن پر مغز ہے۔ اس عنوان پر تفصیل سے لکھا جانا چاہیے تھا۔ یہ مضمون احمد آباد (گجرات) کے ولی سیمینار میں پڑھا گیا۔ سیمیناروں میں مضمون خوانی کو تھوڑا ہی وقت دیا جاتا ہے لیکن بعد میں جب سیمینار کے مقالات کا مجموعہ شائع ہوتا ہے تو پورا مضمون ان دیدہ وروں کے سامنے آجاتا ہے جو اس کے مخاطب صحیح ہوتے ہیں۔

آٹھواں مضمون " نظیر اکبر آبادی کے واقعات حیات " ہے۔ اثر کے مجموعے میں کل دو مضمون ہیں جن کا موضوع دکنیات نہیں اور یہ ان میں کا دوسرا مضمون ہے۔ ڈاکٹر محمد علی اثر اور ڈاکٹر اکبر علی بیگ نے مل کر " نظیر شناسی " ۱۹۸۷ء میں شائع کی۔ اس میں ۲۲ مقالے ہیں، ۲۰ دوسرے مشاہیر کے، ایک ایک دونوں مرتبین کا۔ نظیر کی سوانح پر اثر کا مضمون خاصا معلوماتی ہے۔ مجھے اس سے کئی چونکا دینے والی معلومات حاصل ہوئیں مثلاً نظیر نے نثر میں بھی کئی کتابیں تصنیف کی تھیں۔ ایک کتاب خالقِ باری کے انداز میں تھی۔ مجھے معلوم نہیں کہ یہ کتابیں دستیاب ہیں کہ نہیں اور یہ واقعی نظیر کی ہیں کہ نہیں؟ میرے لیے یہ بھی چونکا دینے والی اطلاع ہے کہ نظیر مذہباً شیعہ تھے۔ ان کے والد سنّی اور والدہ شیعہ تھیں۔ نظیر اپنی والدہ سے متاثر تھے۔ میرا خیال ہے کہ اس مضمون کی معلومات اثر نے پہلی بار پیش نہیں کیں، یہ ان سے پہلے کی کتابوں میں ملتی ہیں لیکن مجھے یہ اطلاعات پہلی بار ان کی تحریر ہی سے ملیں۔

نواں اور دسواں مضمون محمد قلی قطب شاہ (کتابیات) اور اسد اللہ وجہی (کتابیات) ہیں جن کا موضوع ان کے نام ہی سے ظاہر ہے۔ دونوں مضامین میں کتابیات کی فہرست سے قبل ان شعرا کی مختصر سوانح ہے۔ کتابیات میں پہلے ان شعرا کی تصانیف کی فہرست ہے،

اس کے بعد ان سے متعلق کتابوں اور مضامین کی نشان دہی کی ہے۔ مضامین کو دو زمروں میں درج کیا ہے : کتابوں میں مشمولہ مضامین اور رسالوں میں شائع شدہ مضامین۔ میرا خیال ہے کہ مضامین میں کچھ نہ کچھ شامل ہونے سے رہ گئے ہوں گے لیکن جتنا کچھ پیش کر دیا ہے اس کی اہمیت اور افادیت میں شبہ نہیں۔ محققوں کے لیے یہ دونوں مضامین حوالے کا مواد ہیں۔

اس جائزے سے اندازہ ہو گا کہ گو اس مجموعے کے بعض مضامین گہرے اور گاڑھے عالمانہ نوعیت کے نہیں، پھر بھی ان میں عام و خاص دونوں قسم کے قارئین کی دلچسپی اور افادیت کا سامان ہے۔ یہ عام قاری کو بوجھل نہیں معلوم ہوں گے اور اہلِ تحقیق انہیں بے مایہ نہیں پائیں گے۔

جہاں تک مجھے معلوم ہے ڈاکٹر محمد علی اثر کی صحت ایسی نہیں جو اس عمر میں ہونی چاہیے تھی۔ اس کے باوجود وہ کچھ نہ کچھ علمی اور تحقیقی کام کرتے رہتے ہیں۔ یہ بڑی سعادت ہے۔ کاش دوسرے جوان اساتذہ (اور بزرگ بھی) ان کی تقلید کریں اور مسلسل کام کرتے رہنے کو اپنا شعار بنا لیں۔

گیان چند

(ڈاکٹر گیان چند جین)

سابق پروفیسر و صدر شعبۂ اردو

سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد



جنونی گجراتی کا ایک غیر مطبوعہ قصیدہ

جنونی گجرات کا ایک گمنام شاعر ہے۔ اس نے ۱۱۰۲ھ (۱۶۹۰ء) میں "قصیدۂ معجزہ" کے عنوان سے ایک نظم لکھی تھی۔ جس کا ایک قلمی نسخہ اِدارۂ ادبیات اُردو حیدرآباد کے خزینۂ مخطوطات کی زینت ہے۔ [1] یہ نظم ۱۲۷ اشعار پر مشتمل ہے اور اس میں مولانا روم کے بیان کیے ہوئے فارسی 'معجزۂ نبی' کا دکنی اُردو میں ترجمہ کیا گیا ہے۔

شاعر کا تخلص (جنونی) درج ذیل اشعار میں آیا ہے۔

سب عاقلوں کے ہو گئے ان کی صفت کہتے دہن

پس میں جنونی کیا کہوں کیا آسرا ہے اس اندر

تو نے جنونی یہ سخن در معجزہ کیتا ختم

حق تجھ اوپر آخر کرے اپنے کرم سینتے نظر

قدیم اُردو کے دیگر شاعروں کی طرح جنونی نے بھی اپنی زبان کو "ہندی" کہا ہے۔

---

[1] مخطوطہ ۱۲۶ ب ۔ تذکرہ مخطوطات ادارہ ادبیات اُردو (جلد اوّل) مرتبہ ڈاکٹر زور ص ۶۲

وہ یہ بھی کہتا ہے کہ "میں نے اس قصیدے کا ہندی زبان میں اِن لوگوں کے لیے ترجمہ کیا ہے جو فارسی نہیں سمجھ سکتے ۔

میں اس کوں در ہندی زباں، اس واسطے کہنے لگا جو فارسی سمجھے نہیں، سمجھے اسے خوش دل ہو کر

"قصیدۂ معجزہ" کو جنونی نے ۲۴ ربیع الاول ۱۱۰۲ھ کو منگل کے دن شہر گجرات میں مکمّل کیا تھا۔

درج ذیل اشعار سے قصیدہ کی تاریخ تصنیف، شاعر کے وطن اور اشعار کی تعداد کا پتہ چلتا ہے ۔

ماہ ربیع الاولیں، تاریخ تھی چو بیسویں منگل کے دن گفتیم من، از فضلِ ربّی داد گر

سنہ ایک ہزار اور ایک سو دو برس اوپر در حساب بودست کرد ایں (را) ختم در شہر گجرات اے پسر

اس معجزے کوں گر گنے، کوئی کر کتے بیت ہے آوے گنن والے کے تئیں یہہ سب بہتّر در شمر

آخر الذکر شعر سے پتہ چلتا ہے کہ یہ قصیدہ ۷۲ اشعار پر مشتمل ہے ۔ ڈاکٹر زور نے ادارۂ ادبیات اردو کے نسخے کے حوالے سے جملہ ابیات کی تعداد ۶۴ بتائی ہے حالاں کہ اس میں ۶۶ شعر ہیں قصیدۂ معجزہ کا آغاز حمدیہ اشعار سے ہوتا ہے ۔

اول کہوں حمدِ خدا، یاراں سنو تم کان دھر جس نے زمین و آسماں پیدا کیا شمس و قمر

ستّار وہ، کرتار وہ، غفّار وہ، جبّار وہ قہّار وہ، داتار وہ، اس میں نہیں کوئی دگر

حمد میں ۶ اشعار کہنے کے بعد نعتِ نبیؐ میں ۸ اشعار لکھے ہیں ۔ نعتیہ اشعار سے شاعر کے زورِ بیان اور قدرتِ کلام کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے ۔ بعض اشعار میں چار چار قافیوں کا اہتمام کیا گیا ہے ۔ جس کی وجہ سے شعر کے حسن میں چار چاند لگ گئے ہیں ۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

ہیں احمدِ مرسل وہی، ہیں مظہرِ اوّل وہی ہیں مشکلوں کا حل وہی، ہیں گے وہی خیر البشر

ہیں گے خدا کے وہ رسول، حق نے کیا ان کوں قبول ہے تازہ خوشبو جیوں پھول، نبیوں کے سر پر سربسر

نعتِ نبی کے سلسلہ میں شاعر آگے چل کر کہتا ہے کہ اگر کاغذ کی جگہ آسمان ہو، سارے جہاں کے لوگ کتابت کرنے لگیں اور دنیا کے تمام اشجار کو قلم اور دریاؤں کو دوات بنا دیا جائے تو تب بھی آنحضرت صلعم کی تعریف ممکن نہیں ۔

کاغذ ہوئے گر آسماں، کاتب ہوئے خلقِ جہاں ہووے قلم سب درختاں، دوات دریا یا مگر

ہرگز لکھا جاوے گا نئیں یک نکتہ ان کے وصف کا / عاجز ہے ان کے وصف میں دو جگ میں خلق بحر و بر

نعتیہ اشعار کے بعد شاعر نے ایک شعر میں سببِ تالیف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے ؎

اپنے نشاں کے واسطے، آوے جو مجھ کہنے منیں / اعجاز کے ان کے سخن، جز دے نہ عقلِ مختصر

اس سلسلے میں جنونی نے عربی، ترکی اور فارسی زبان کی خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے "ہندی" میں شعر کہنے کی وجہ اس طرح بیان کی ہے ؎

دنیا منیں ہے یہ زباں، عربی و ترکی فارسی / باقی نہیں اندر حساب ہے قول ان کے معتبر

بولی عرب کی ہے سری سب بولیوں کی بے سخن / ترکی شجاعت کارنی، ہے فارسی بابت شکر

میں اس کوں در ہندی زباں اس واسطے کہنے لگا / جو فارسی سمجھے ناہیں، سمجھے اسے خوش دل ہو کر

اِن اشعار کے بعد شاعر نے درج ذیل شعر سے معجزے کی ابتدا کی ہے ؎

کہتا ہوں میں اب یں معجزہ راوی روایت میکند / یک دن مدینے میں نبی، مسجد میں جو بیٹھے مگر

روایت یوں بیان کی جاتی ہے کہ ایک دن آنحضرتؐ صحابہ کرام کے ساتھ مسجد میں بیٹھے حق کی معرفت بیان کر رہے تھے کہ اچانک ابوجہل آپہنچا اور مدینے کے لوگوں کو جمع کر کے حضورؐ سے کہنے لگا کہ ؎

آکر کہا یا مصطفٰے کانوں سنو میرا کہا / تیں بے شک و شبہ ور یا گر ہے رسولِ داد گر

دعوئ نبوت کا تجھے ہیگا اگر دکھلا مجھے / یہ معجزہ اس خلق میں ورنیں مکن دعوئ دگر

ابوجہل نے کہا کہ آپؐ کے میدان میں بہت دنوں سے ایک "اُجلا و زیبا" پتھر پڑا ہوا ہے۔ اگر آپؐ اس پتھر کو ایسے درخت میں تبدیل کر دیں، جس کی ڈالیاں انواع و اقسام کے میووں سے لدی ہوئی ہوں اور اِس کے ہر پتے پر خدا کا اور آپؐ کا نام تحریر ہو۔ اس درخت پر بیٹھے ہوئے خوش رنگ پرندے آپؐ کی رسالت کی گواہی دیں تو ہم ابھی کفر کو ترک کر کے مسلمان ہو جائیں گے۔

آنحضرتؐ نے ابوجہل سے جب یہ گفتگو سنی تو غور و فکر کرنے لگے ؎

اس بیچ میں بہر خدا آئے دمادم جبرئیل / از پیشِ خلاقِ جلیل سوتش بکردہ باز سر

جبرئیل نے تب ہی کہا، یا مصطفٰے یا مجتبٰی / حق نے کہا تم کوں سنو اس بات میں کچھ غم نہ کر

میں جانتا تھا اے یتیم یہ بات از علمِ قدیم / کئی معجزے اہلِ جحیم مانگیں گے تجھ سوں آن کر

آ گل سیں پیدا کر رکھا اس رو کھ کوں یا مصطفیٰ باآں ثمر ہا جا بجا، مرغاں سبھی ڈالوں اوپر
اُٹھ جاؤ خوش حالی سیتے کچھ غم نہ لیاؤ دل منیں مانگو جو ہیں یہ مانگتے فی الحال رفتہ زاں شجر

جبرئیل نے آنحضرتؐ کو یہ مژدہ سنایا تو آپؐ نے پتھر کو "حق کا کہا" سنایا۔ خدا کی قدرت سے اسی وقت وہ پتھر ایک درخت میں تبدیل ہو گیا۔ اس کی شاخوں پہ طرح طرح کے میوے تھے اور اس پر بیٹھے ہوئے خوش رنگ پرندے "اہلِ کفر" سے مخاطب ہو کر کہہ رہے تھے۔

یو ہیں نبی مصطفیٰ، یو ہیں رسول مجتبیٰ آ ہیں خلق کے رہنماں اے نیک خواہاں دین (اگر)
ہیں خاصہ رحمان یہہ ہیں اشرف انسان یہہ ہیں مظہر قران یہہ، ایسا نہیں کوئی دگر
والشمس ان کا روے ہے واللیل ان کا موے ہے عطرے سو ان کے خوے ہے سدرہ فروں خوشبوے تر
شہ ہے سبھی شاہاں کے خورشید ہے آسمان کے ہیں نور وہ چشماں کے، درمیان ہے حسنہ جگر

اس کے بعد آنحضرتؐ کے چند اور معجزے بیان کیے گیے ہیں۔ ملاحظہ کیجئے۔

ان چاند دو ٹکڑے کیا، دیکھا تمھونے آنکھ سوں بولیا اونھوں کے ساتھ وہ بزغائہ کردہ زہر
جابر کے دو فرزند کوں موے پیچھے جیوتے کیے جنگل سیتے ہرنی چھڑا دیسے زدست صید کر
دوبلی بکری کی پیٹ پر دستِ مبارک جب رکھا موٹی ہوئی وہ اس قدر تھن سیتے دودھ آیا اُپر
یہ معجزہ ہر روز ہی دیکھو تم آنکھوں کھول کر جب دھوپ میں راکھیں قدم، بادل کا سایا سر اوپر

ابوجہل اور اس کے ساتھیوں نے جب اپنی آنکھوں سے، جیسا وہ چاہتے تھے معجزہ دیکھا تو۔

شرمندگی سیں وہ سبھی لاگے کہتے دیکھو تبھی تجھ سا نہیں دیکھا کبھی ہم سحر میں کوئی دگر
عقلاں خلق کے دے چلا، انکھیں رکھے سب کے تلا تیں ساحراں میں بر ملا، سب ساحراں تھے بیشتر

آنحضرتؐ نے "ان کافران بد سیر" کو مخاطب کر کے کہا کہ یہ ساحری کا کمال نہیں ہے بلکہ خدا کی قدرت ہے۔

قدرت ہے یہ کرتار کی، یہ ہے صفت دا تار کی یہہ مظہر جبار کی، یاں سحر کا نا ہیں گذر

جبرئیل اسی وقت فرمان خداوندی کے ساتھ آپہنچے اور آنحضرت سے کہا اگر آپؐ اجازت دیں تو میں اسی وقت اس قوم کو "قہر و غضب کی آتش" میں ڈال کر زیر و زبر کر دوں ـــــ

یہ لوگ گمراہ ہو چکے ہیں اور ان کے دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں ؎

یہ دل سیتے گمراہ ہیں یا اندرونی سیاہ ہیں   درخور و آتش کاہ ہیں ہے قفل ان کے دل اُپر

درج ذیل اشعار پر یہ قصیدہ اختتام کو پہنچتا ہے۔

وے مکر ما ہو منفعل بھاگے اپس کے گھر کے تئیں   واں سیں یہاں خوش دل نبی آئے اپس کے گھر بھتر

تو نے جنوبی یہ سخن در معجزہ کیتا ختم   حق تجہ اوپر آخر کرے اپنے کرم سیتے کرم

ماہِ ربیع الاولیں تاریخ تھی جو بیسویں   منگل کے دن گفتیم من از فضل ربّی داد گر

سنہ ایک ہزار اور ایک سو دو برس اوپر در حساب   بو دست کردایں (را) ختم در شہر گجرات اے پسر

اس معجزے کوں گر گتے کوئی کہ کتنے بیت ہے   آوے گتن والے کے تئیں یہہ سب بہتر درشمر

یں مانگتا ہوں یہہ ہووے... دل وجاں سیں مدام   یارب بحق مصطفٰے برخلق عالم کرم کر

جان محمد عاجز نے "معجزات نبی" کے عنوان سے ۱۱۴۷ھ سے قبل ایک مثنوی لکھی ہے جس میں پیش نظر معجزہ تیسرے نمبر پر ہے۔ اس مثنوی کا قلمی نسخہ انجمن ترقی اردو کراچی کے کتب خانہ کی زینت ہے۔ مولوی افسر صدیقی امروہوی نے اس معجزے کی صراحت کرتے ہوئے لکھا ہے۔ " اس میں بیان کیا گیا ہے کہ ابوجہل اور اس کے ساتھی حضورؐ کے سامنے آئے اور کہا کہ اگر تم سچے پیغمبر ہو تو سامنے پڑے ہوئے پتھر سے ایک ایسا درخت اپنے معجزے سے پیدا کرو کہ اس کے ہر پتے اور پھول پھل پر اللہ اور رسول کا نام لکھا ہو اور اس درخت پر جو جانور بیٹھا ہو تمہارا ذکر کرتا ہو۔ آپؐ نے کہا وہ پتھر کہاں ہے؟ کفار حضورؐ کو پتھر کے پاس لے گئے اور حضورؐ نے صمیم قلب سے بارگاہِ الٰہی میں دعا فرمائی۔ معاً پتھر شق ہو گیا اور اس سے ایک ایسا ہی پیڑ برآمد ہوا جیسا کہ کافروں نے چاہا تھا[۱]"

مخطوطے کی کیفیت :۔ پیش نظر مخطوطہ ۵×۸ کے ۱۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ ہر صفحے پر خط نستعلیق شکستہ میں پندرہ سطریں تحریر کی گئی ہیں۔ اردو سے قدیم کے دوسرے مخطوطوں کی طرح

---

[۱] مخطوطات انجمن ترقی اردو کراچی (جلد ۵) صفحہ ۲۸۷

اس میں بھی یائے معروف اور یائے مجہول میں کوئی امتیاز نہیں ملتا "ک" اور "گ" دونوں ایک ہی مرکز لگایا گیا ہے۔ ٹ۔ ڈ۔ ڑ کے لیے ت۔ د۔ ر کا استعمال کیا گیا ہے۔ جیسے

جریا (جڑیا)۔ بیتے (بیٹھے)۔ پرھیں (پڑھیں)۔ دال (ڈال) وغیرہ اکثر لفظوں کو غیر ضروری طور پر ملا کر لکھ دیا گیا ہے۔ جیسے

استام (اس نام)۔ دلو جان (دل و جاں)۔ مالوزر (مال و زر)

چشمو چراغ (چشم و چراغ)۔ روموشام (روم و شام) شمسو قمر (شمس و قمر) وغیرہ حرف اضافت کو ظاہر کرنے کے لیے یائے مجہول کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ مثلاً

حمدے خدا (حمدِ خدا)۔ فرشے زمیں (فرشِ زمیں)۔ نورے نبی (نورِ نبی) وغیرہ بعض مقامات پر شاعر نے ایک مصرع قدیم اردو میں اور ایک فارسی میں تحریر کیا ہے مثلاً

اس نیسخ میں بہر خدا آے دما دم جبرئیل

از پیش خلاق جلیل سوئیش یکردہ باز سر

سنہ ایک ہزار اور ایک سو دو برس اوپر در حساب (کذا)

بو دست کرد ایں ختم در شہر گجرات اے پسر

قصیدہ

(متن)

اول کہوں حمدِ خدا یاراں سنو تم کان دھر
جس نے زمین و آسماں پیدا کیا شمس و قمر
ستّار وہ، کرتار[1] وہ، غفّار وہ، جبّار وہ
قہّار وہ، داتار[2] وہ، اس بن نہیں کوئی دگر
اس نے کیا از صنع خود پیدا سبی دنیا میں[3]
ہوئے ہیں آگل[4] بستے[5] جو ہیں ہوئیں گے پھر دگر
اسمان کوں[7] سر پانوں[8] لگ دے کر ستاروں سوں جڑا
ایسے سپر کے پھول کوں جڑیا[9] جڑے دُر و گہر

---

[1] خالق۔ مالک، پیدا کرنے والا [2] دینے والا [3] میں [4] قدیم۔ پہلے [5] سے [6] ہوں گے [7] کو [8] سر سے پاؤں تک

پھر کر کیا فرشِ زمیں از بہرِ جن و انس و وحش
ہیں جہاں بھیتر[۱] سبھی کرتے ہیں اس کا ہی ذکر
نورِ نبی کوں سب سیتے اوّل کیا پیدا او تھے
تس پیچھے[۲] اِس کوں[۳] کیا ظاہر زماں کے جو بھتر[۱]
پس جس کی یہ عزت ہوی کہنا روا ہے نعتِ او
اس نام پر کیجے فدا اپنا دل و جاں مال و زر
ہیں احمد مرسل وہی، ہیں مظہرِ اوّل وہی
ہیں مشکلوں کا حل وہی، ہیں گے وہی خیر البشر
ہیں گے خدا کے وہ رسول حق نے کیا ان کوں قبول
ہے تازۂ خوشبوز پھول، بنیوں کے سر پر سربسر
دل کا مرے آرام وہ، چشم و چراغ و کام وہ
دو جگ میں صاحب راج وہ، شاہاں سب اس کے خاکِ در
سلطانِ روم و شام جو، اس کے غلاموں کے غلام
سب کی بندگی ہے تمام، اس پاس از وہ گل لشکر
کاغذ ہووے گر آسماں، کاتب ہوے خلق جہاں
ہووے قلم سب درختاں[۴] دوات دریا ہا مگر
ہرگز لکھا جاوے گا نیں[۵] یک نکتہ ان کے وصف کا
عاجز ہے ان کے وصف میں، دو جگ میں خلق بحر و بر

---

[۱] اندر [۲] اس نے [۳] پیچھے [۴] کو [۵] درخت کی جمع [۵] نہیں

سب عاقلوں کے سُدھ گیے، ان کی صفت کہتے منیں
پس میں بجز توفیق کیا کہوں، کیا آسرا ہے اس اندر
اپنے نشاں کے واسطے، آوے جو مجھ کہتے منیں
اعجاز کے ان کے سخن، بجز وے تہِ عقلِ مختصر
اندر زبان فارسی یہ معجزہ ملّائے روم
ہوگا جو کیا خوب نیکو، تم نے سنا ہے بیشتر
دنیاں منیں ہے یہ زباں، عربی ترکی فارسی
باقی نہیں اندر حساب ہے قول ان کے معتبر
بولی عرب کی ہے سری سب بولیوں کی بے سخن
ترکی شجاعت کارنی ہے فارسی باشد شکر
میں اس کوں در ہندی زباں، اس واسطے کہنے لگا
جو فارسی سمجھے نہیں، سمجھے اسے خوش دل ہوکر
کہتا ہوں اب یہ معجزہ، راوی روایت میکند
یک دن مدینے میں نبی، مسجد میں جو بیٹھے مگر
تھے ان کے گرد و پیش بیٹھے، با ادب وہ با ادب
ابوبکر، عمر، عثمان، علی، باقی صحابہ بے شمر
بیٹھے نبیؐ یاروں کے بیچ، کہتے تھے حق کی معرفت
ناگہہ ابوجہل آ رہا یا مکر ہا ہے پر مکر (کذا)
خلقِ مدینہ جمع کر، چھوٹا بڑا[۱۶] لیا یا سبھی
از انتہام مرد ماں پیدا ہوا روزِ حشر (کذا)
آکر کہا یا مصطفیٰ کانوں سنو میرا کہا!
نیئں بے شک وشبہ ورہ یا گر ہے رسول داد گر

دعویٰ نبوت کا تجھے ہیگا اگر دکھلا مجھے
یہ معجزہ اس خلق میں وڑ یتیں ممکن دعوا دگر
ہیگا ترے میداں میں باہر چلو دیکھو نکلا
بہتے[17] دنوں سیتی[18] پڑا اجلا زیبا ایک پتھر[19]
گر اس سیتے پیدا کرو یک رو کھ[20] جب ڈالوں سیتے
میوا ہووے ہر ڈال پر - - - - -
امرود انجیر و انار و سیب و رطب بھی عنب
لاگے اونھوں ڈالوں[21] سیتے ہر یک کہ گفتم دیگر ثمر
ہر پات پر نام خدا اور نام بھی تیرا ہووے
ہم جو اُسے دل سیں پڑھیں ایمان لیا[22]ویں تم اُپر
ہر ڈال پر بیٹھے ہووے ایک ایک مرغ اس رنگ کا
یاقوت چونچوں لال پاوں باقی سبھی سفید پر
دیویں گواہی مرغ ہر یک رسالت کی تیرے
گر یو کرے پیدا ابھی دیکھیں جو ہم اپنی نظر
ہوویں مسلماں یک سری تب دیں کریں تیرا قبول
بیزار ہوویں از کفر چھوڑیں رہیں مادر پدر
جب مصطفیٰ نے یوں سُنا بوجہل سیتے خلق میں
سر ڈال کے آگے رہے دل میں کیے بہتر فکر
اس بیچ میں بہر خدا آے دما دم جبرئیل
از پیش خلاق جلیل سوئش یکردہ بازسر

---

[17] بہت [18] سے [19] پتھر [20] درخت [21] ڈال کی جمع [22] بلائیں

جبرئیل نے تب ہی کہا، یا مصطفےٰ یا مجتبیٰ

حق نے کہا تم کوں سنو، اس بات سیتی کچھ غم نہ کر

میں جانتا تھا اے یتیم، یہ بات از علم قدیم

کئی معجزے اہلِ جحیم مانگیں گے تجھ سوں آن کر

اگل سیں[٢٣] پیدا کر رکھا اس روکھ کوں یا مصطفیٰ

با آں ثمر ہا جا بجا، مرغاں سبھی ڈالوں اوپر

اُوٹھ جاؤ خوش حالی سیتے کچھ غم نہ لیاؤ دل منیں

مانگو جو ہیں یہ مانگتے فی الحال رفتہ زاں شجر

اس مژدہ سیں احمد نبی خوش حال ہو کر اُٹھ چلے

جا کر کہا یہ کفرے سیتے، حق کا کہا کرا ے پسر

قدرت خدا کی سیں تبھی وہ روکھ جھٹ ڈالیوں سیتے

با میوہ ہاو مرغاں پیدا ہوا زاں سربسر

جیسے انہوں مانگے اتھے[٢٤] پیدا ہوے ویسے سبھی

ہرگز تفاوت ناں[٢٥]، ان کے کہن[٢٦] میں در شجر

ہریک مرغ ڈالیوں سیتے تب بول کر کہنے لگا

اے اہلِ کفر ہم سیں سنوں[٢٧] یہ ہیں رسولِ معتبر

یو[٢٨] ہیں نبیِ مصطفیٰ، یو ہیں رسول مجتبیٰ

اے[٢٩] ہیں خلق کے رہنماں[٣٠] اے نیک خواہاں دیں اگر

---

٢٣ پہلے سے ٢٤ تھے ٢٥ نہیں ٢٦ کہنے کے مطابق

٢٧ سنو ٢٨ یہ ٢٩ یہ ٣٠ رہنما

ہیں خاصہ رحمان یہہ، ہیں اشرفِ انسان یہہ
ہیں مظہرِ قرآن یہہ، ایسا نہیں کوئی دگر
ملکِ عرب میں شاہ یہہ چرخِ نجم ماہ یہہ
دو جگ میں عالی جاہ یہہ، یا کوں لطیفِ خوش گہر
والشمس ان کا روے ہے، واللیل ان کا موے ہے
عطرے سو ان کے خوے ہے، سدرہ فردوں خوشبوے ہے
شہ ہے سبھی شاہان کے خورشید ہے آسمان کے
ہیں نور وہ چشمان کے، درمیان ہے خستہ جگر
حق کے حبیبِ خاص یہہ اس روسیتے اخلاص یہہ
عالم میں خاص الخاص یہہ، یارب شکر ہر سر
ان چاند دو ٹکڑے کیا، دیکھا تمھو[۳۱] نے آنکھ سوں
بولیا[۳۲] ادھوں[۳۳] کے ساتھ وہ .نز خائلہ کردہ زہر
جابر کے دو فرزند کوں موے پیچھے[۳۴] جیو[۳۵] تے کیے
جنگل سیتے ہرنی چھڑا دیسے زدست صید کر
دوبلی[۳۶] بکری کی پیٹ پر دست مبارک جب رکھا
موٹی ہوی وہ اس قدر تھن سیتے دودہ آیا اپر
یہ معجزہ ہر روز ہی دیکھ تم آنکھوں[۳۷] کھول کر
جب دھوپ میں راکھیں[۳۸] قدم بادل کا سایا سراوپر
شرمندگی سیں وہ سبھی لاگے[۳۹] کہنے دیکھو تبھی
تجھ سا نہیں دیکھا کبھی، ہم سحر میں کوئی دگر

---

۳۱ تم ۳۲ بولا ۳۳ ان لوگوں کے ۳۴ مرنے کے بعد ۳۵ زندہ ۳۶ دبلی ۳۷ آنکھیں ۳۸ رکھیں ۳۹ لگے

عقلاں[40] خلق کے دے چلا، آنکھیں رکھے سب کے سُلا

تیں ساحراں یں برملا، سب ساحراں تھے بیشتر

اس سحر یں سب ساحراں[42] آگل سیں لیکر حال پر

بیٹھے تو عاجز ہوے کر، با سامری بستہ مکر

سیّد جدھاں سیں[43] یہہ سُنا، بوجہل سیتے خلق یں

ان کے طرف جو یوں کہا، اے کافراں، بد سیر

قدرت ہے یہ کرتار کی، یہ ہے صفت داتار کی

یہہ مظہرِ جبّار کی، یاں سحر کا ناہیں[44] گذر

پھر جبرئیل آئے تبھی، کہیا[45] نبی کوں یا نبی

حق نے کہا ہیگا ابھی، گر تم کہو مجھ کوں اگر

ڈالوں لیکر اس قوم کوں در آتشِ قہر و غضب

اک سات[46] میں جھٹ بیخ سوں ان کوں کروں زیر و زبر

یہ دل سیتے گمراہ ہیں، با اندرو نے سیاہ ہیں

درخورد آتش گاہ ہیں، ہے قفل ان کے دل اُوپر

وے مکر ہا ہو منفعل بھاگے ایس کے گھر کے تیں

واں سیں[48] یہاں خوش دل نبی آئے ایس کے (گھر بھتر)

---

[40] عقل کی جمع [41] سے [42] ساحر کی جمع (جادوگر) [43] جب سے [44] نہیں [45] کہا [46] ساعت [47] اپنے [48] وہاں سے

تو نے جنونی یہہ سخن در معجزہ کیتا[۴۹] ختم

حق تجہ اوپر آخر کرے اپنے کرم سیتے نظر

ماہِ ربیع الاولیں تاریخ تھی پچو بیسویں

منگل کے دن گفتیم من از فضلِ ربی داد گر

سنہ ایک ہزار اور ایک سو دو برس اوپر در حساب

بو دست کرد ایں درا ختم در شہرِ گجرات اے پسر

اس معجزے کوں گر گنے کوئی کہ کیتے بیت ہے

آدے گنن وانے[۵۰] کے تئیں یہہ سب ہزار در شمر

میں مانگتا ہوں یہہ ہووے دل دجاں سیں مدام

یارب بحق مصطفیٰ پر خلق عالم کر رحم کر

---

۴۹. کیا   ۵۰. گننے والے۔ شمار کرنے والے۔

(برائے " سایر نامہ احمد آباد یہ قربانیش پروفیسر وارث علوی)

حافظ سیّد محمّد فراقی

فراقی عادل شاہی عہد کے دورِ آخر کے ایک کہنہ مشق شاعر اور بیجاپور کے متوطّن تھے۔ احوالِ قیامت کے موضوع پر ایک ضخیم مثنوی "مراۃ الحشر" کے علاوہ ان کی چند غزلیں بھی دستیاب ہوئی ہیں۔ "مراۃ الحشر" کے درجِ ذیل شعر میں انھوں نے اپنا نام سیّد محمّد اور تخلص فراقی بتایا ہے۔

فراقی تخلص ہے میرا مدام
ولے اصل سیّد محمّد ہے نام

فراقی دکنی اُردو کے اِن خوش نصیب شاعروں میں سے ہیں جن کی شہرت شمالی ہند تک پہنچ چکی تھی۔ چناں چہ شمالی ہند کے تذکروں "مخزنِ نکات"، "تذکرۂ شعرائے اُردو"، "عمدۂ منتخبہ"، "مجموعۂ نغز" اور "گلِ رعنا" میں اِن کا ذکر ملتا ہے۔ قائم نے اپنے تذکرے (مخزنِ نکات) میں یہ بھی اطلاع دی ہے کہ فراقی نے محمّد یار خاں صوبہ دار دہلی

کے زمانے (۱۱۰۸ھ - ۱۱۱۴ھ) میں دہلی کا سفر کیا تھا۔[1] مولوی نصیر الدین ہاشمی لکھتے ہیں کہ اورنگ زیب عالمگیر کی فتح دکن کے بعد، فراقی نے کچھ عرصہ تک اورنگ آباد میں قیام کیا اور پھر جنوبی ہند پہنچ کر ویلور میں سکونت اختیار کرلی۔[2] ڈاکٹر محی الدین قادری زور کا بیان ہے کہ فراقی نے فقیر اللہ آزاد اور ولی کے ساتھ اورنگ آباد سے نکل کر سورت، احمد آباد اور دلی کا سفر کیا۔[3]

غوثی ارکاٹی بن فصیحی نے "ریاض غوثیہ"[4] (۱۱۶۹ھ) میں جہاں دبستان دکن کے باکمال مرحوم شعراء نصرتی، غواصی، فصیحی، ہاشمی اور ان کی بے مثال مثنویوں "گلشن عشق"، "سیف الملوک و بدیع الجمال"، "نوبہار" اور "یوسف زلیخا" کے نام گنوائے ہیں، وہیں فراقی اور ان کی مثنوی "مراۃ الحشر" کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ غوثی کے اشعار ملاحظہ ہوں:

نصرتی ہو بحر گلشن میں نہنگ
گوہر مقصو دلایا اپنے سنگ
فصیحی ہو عندلیب خوش نوا
نو بہار اپنا کھلایا بے بہا
پھر غواصی قصۂ سیف الملوک
کہہ گیا کر شعر کے فن سوں سلوک
دھر فراقی وصل رب کا اشتیاق
او مراۃ الحشر بولے لے فراق
ہاشمی بولیا زلیخا ذوق سوں
عشق میں چک رو کے کھویا شوق سوں

---

[1] قائم چاند پوری۔ مخزن نکات ص۷۔ [2] نصیر الدین ہاشمی۔ دکن میں اردو ۱۹۶۳ء ص۳۷۵

[3] تذکرہ مخطوطات ادارہ ادبیات اردو (جلد چہارم) ص۲۷۲

[4] ریاض غوثیہ (قلمی) کتب خانہ انجمن ترقی اردو کراچی

سب اوا پنی طبع کا جودت دِکھا
چھوڑ گئے آخر کوں یہ فانی سرا[5]

ولی دکنی کے ایک شعر سے پتا چلتا ہے انہوں نے فراقی کے ایک مصرع پر گرہ لگائی تھی۔

ولی مصرع فراقی کا پڑھوں تب جب کہ وہ ظالم
"کمر سوں کھینچتا خنجر پڑھا تا آستیں آوے"[6]

ولی نے اپنے کلام میں جہاں اپنے متعدد بے تکلف احباب کا تذکرہ کیا ہے وہیں اپنے شاعرانہ مرتبے کا فراقی سے تقابل کرتے ہوئے لکھا ہے۔

تیرے اشعار ایسے ہیں فراقی
کہ جس پر رشک آوے گا ولی کوں[7]

جناب افسر صدیقی امروہوی نے "فہرست مخطوطات انجمن ترقی اردو کراچی"[8] (جلد پنجم) میں روضۃ الاولیائے بیجاپور" اور "تذکرہ اولیائے رائچور" کے حوالے سے اور مولوی محمد اکبر دین صدیقی نے "بجھتے چراغ"[9] میں درگاہ حضرت امین الدین اعلیٰ اور کتب خانہ قادری محل بیجاپور کی بعض قلمی بیاضوں کی مدد سے فراقی کے خاندان حالات پر روشنی ڈالی ہے، جن کا مختصر خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

حافظ سید محمد فراقی کے والد کا نام سید کریم محمد حسینی (متوفی ۱۱۰۵ھ) تھا دادا سید میراں محمد مدرس قادری کے نام سے شہرت رکھتے تھے۔ میراں محمد مدرس کے والد یعنی فراقی کے پردادا روح اللہ بھروچی تھے" جو حضرت امام موسیٰ کاظم کی اولاد میں تھے[10]۔ فراقی کے دادا (سید محمد مدرس) سید شاہ صبغۃ اللہ حسینی بھروچی نائب رسول اللہ کے بھتیجے تھے[11]۔ سید کریم محمد حسینی کی وفات کے بعد فراقی کے بڑے بھائی سید عبدالقادر سجادہ نشین ہوئے اور ان کے

---

[5] افسر صدیقی امروہوی۔ مخطوطات انجمن ترقی اردو کراچی (جلد اول)۔ ۱۹۶۵ء۔ ص ۴۲ [6] ڈاکٹر جمیل جالبی۔ تاریخ ادب اردو (جلد اول) لاہور ۱۹۷۵ء ص ۵۳۶ [7] ایضاً ص ۵۳۶ [8] صفحہ ۲۸۰ [9] صفحہ ۱۴۹
[10] ایضاً ص ۱۵۲ [11] افسر صدیقی۔ مخطوطات انجمن۔ کراچی (جلد ۵) ص ۲۸۰

انتقال کے بعد خرقۂ خلافت سید محمد فراقی کے حصّے میں آیا۔ [۱۲]

فراقی کی تاریخ رحلت ۹ شوال ۱۱۴۴ھ ہے۔ مادہ تاریخ وفات "فی حفظ اللہ" ہے۔ ان کا مزار جامع مسجد بیجاپور کے نزدیک اپنے آبائی قبرستان میں ہے [۱۳] فراقی کو ایک لڑکا کریم محمد ثانی عرف بادشاہ قادری اور دو لڑکیاں فاطمہ صاحبہ اور بی بی صاحبہ تھیں [۱۴]۔

"مراۃ الحشر" کے درج ذیل اشعار سے پتا چلتا ہے کہ فراقی نے اپنے صاحبزادے کا نام "کریم" وہی رکھا ہے جو ان کے دادا نے اپنے بیٹے کا رکھا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کریم محمد ثانی کو مخاطب کر کے کہتے ہیں۔

... باپ کا نام تیرا رکھیا
کہ جیوں باپ ... پ میرا رکھیا
کرم کر جو ہے ناتوں تیر... کریم
کہ بولے ہر اک شخص میرا کریم

"مراۃ الحشر" کی تصنیف کے وقت کریم محمد ثانی کی عمر چار سال تھی جب ... فراقی چھتیس سال کے تھے۔

مری سن ہے چالیس تے چار کم
تو چو تھے میں اب لیا رکھیا ہے قدم
تیری ہور مری مل کے چالیس سال
کتے ہیں کہ چالیس میں ہے کمال
نہ کچھ فائدہ ہے مرے سوں بھے
کمال آج تو ہے تیرے سوں مجے [۱۶]

---

[۱۲] ایضاً ص ۱۶۲ [۱۳] مراۃ الحشر (قلمی)، ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد [۱۴] ایضاً [۱۵] ایضاً [۱۶] مراۃ الحشر (قلمی)، کتب خانہ تحقیقات مشرقی حیدرآباد

کریم محمد ثانی' فراقی کے اکلوتے بیٹے تھے۔" مراۃ الحشر" میں "پندِ فرزند" کے موضوع کے تحت وہ کہتے ہیں کہ" صالح فرزند" خدا کی بے بہا دین ہے۔ مرنے کے بعد بھی فرزند کی بدولت دنیا میں نام باقی رہتا ہے۔ جب وہ فاتحہ پڑھے گا تو اس کے تحائف ملتے جائیں گے اور اس طرح مرنے والے کی روح کو شادمانی کے مواقع میسر آئیں گے۔

کہ فرزند صالح ہے جس کوں اگر
اسی کو رخ زینت ہے دنیا بھر
موئے تو بی دنیا میں رہتا ہے ناؤں
کہ فرزند تے ہے نشانی کوں ٹھانوں
پڑے گا مری فاتحہ یاد کر
رکھے گا مرے جیو کوں شاد کر
تحائف مجھے پو پہنچتے جائیں گے
مرے حق منے کام کچھ آئیں گے[۱۶]

پھر وہ اپنے صاحبزادے کو نصیحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے مرے فرزند میری بات دھیان سے سن۔ نیک اور صالح اصحاب کی صحبت اختیار کر۔ اپنے آپ میں نیک بختی کے ہنر پیدا کر کیوں کہ نیک بختی سے ماں باپ کو بھی فائدہ پہنچتا ہے۔ ماں باپ کا سہارا ہمیشہ کام نہیں آتا۔" میں بھی ایک دن اسی طرح جاں بحق تسلیم ہو جاؤں گا جس طرح میرے والد نے داعیِ اجل کو لبیک کہا تھا۔

مری بات لے کان میں اے پسر
توں کر نیک بختی کے پیدا ہنر
ملا نیک بختاں منے آپ کوں
کہ تیرے تے ہوئے نفع ماں باپ کوں

---

۱۶ ایضاً

ہنر مند اپے آپ کوں کر دیکھائے
نہ ماں باپ کا آسرا کام آئے
رہیا کاں مرا باپ میرے اوپر
جو رہے گا تیرا باپ تیرے اوپر[18]

آگے چل کر وہ اپنے بیٹے کو درویشی اور قناعت کا راستہ اختیار کرنے کی تلقین کرتے ہوئے بارگاہِ ربّ العزّت میں دست بہ دعا کہتے ہیں کہ "اے خدا میرے خاندان کے شجر پر ہمیشہ نئے پھول پھل آتے رہیں اور کبھی اس پر خزاں کا سایہ نہ پڑنے پائے۔

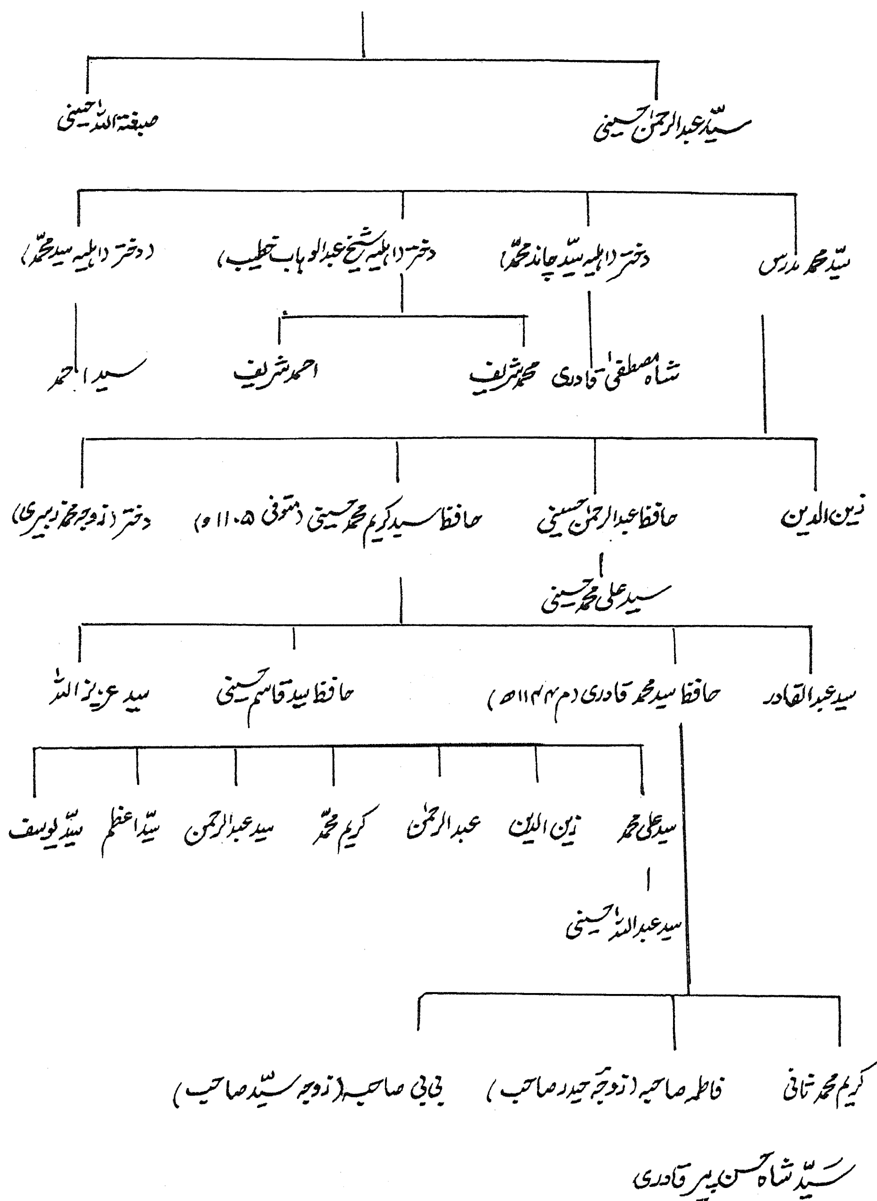
پھر امیدؔ ہے مجہ خدا سوں سدا
کہ جو آئے گا پھول ہور پھل نوا
اچھے تازگی ہور تراوٹ بڑی
نہ آوے کدی تس اوپر پت جھڑی[19]

سید کریم محمدؐ ثانی کے بیٹے سید حسن قادری رائچور چلے گئے تھے اور وہیں انتقال کیا[20] ان کی اولاد میں اکثر اصحاب بقیدِ حیات ہیں جو آج بھی ان کا عرس مناتے ہیں[21] کچھ ورثا ارکاٹ، بیجاپور اور سات گڈھ میں بھی موجود ہیں[22]

ذیل میں سیدؔ محمد قادری فراقی کا شجرہ درج کیا جاتا ہے۔[23] چوں کہ یہ ایک نئی دریافت ہے اور اس سے فراقی کے عزیز و اقارب کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہیں، اس لیے اس کی اہمیت مسلّمہ ہے۔

---

[18] تا [19] مخطوطہ مخزونہ کتب خانہ و ادارۂ تحقیقات علوم مشرقی حیدرآباد۔ [20] افسر صدیقی مخطوطات انجمن ترقی اُردو کراچی (جلد ۵) ص ۲۸ [21] بجھتے چراغ ص ۱۶۲
[22] ایضاً [23] ایضاً ص ۱۶۳


روح اللہ حسینی بھروچی
سید عبدالرحمن حسینی
صبغۃ اللہ حسینی
سید محمد مدرس
دختر (اہلیہ سید چاند محمدؒ)
دختر (اہلیہ شیخ عبدالوہاب خطیب)
دختر (اہلیہ سید محمدؒ)
شاہ مصطفیٰ قادری
محمد شریف
احمد شریف
سید احمد
زین الدین
حافظ عبدالرحمن حسینی
حافظ سید کریم محمد حسینی (متوفی ۱۱۰۵ھ)
دختر (زوجہ محمد زبیری)
سید علی محمد حسینی
سید عبدالقادر
حافظ سید محمد قادری (م ۱۱۴۴ھ)
حافظ سید قاسم حسینی
سید عزیز اللہ
سید علی محمد
زین الدین
عبدالرحمن
کریم محمد
سید عبدالرحمن
سید اعظم
سید یوسف
سید عبداللہ حسینی
کریم محمد ثانی
فاطمہ صاحبہ (زوجہ حیدر صاحب)
بی بی صاحبہ (زوجہ سید صاحب)
سید شاہ حسن پیر قادری

موجودہ معلومات کی روشنی میں فراقی کی ایک ضخیم مثنوی "مراۃ الحشر" کے علاوہ دو نعتیں ۹ غزلیں اور بعض غزلوں کے چیدہ چیدہ اشعار دستیاب ہوئے ہیں۔ "مراۃ الحشر" ہنوز غیر مطبوعہ ہے اور اب تک اس کے چھ مخطوطات کا پتا چلتا ہے۔ کتب خانہ و ادارۂ تحقیقات علوم مشرقی حیدرآباد (کتب خانۂ آصفیہ) میں اس مثنوی کے دو قلمی نسخے موجود ہیں۔ دو نسخے انجمن ترقی اردو کراچی کے کتب خانے کی زینت ہیں، جب کہ کتب خانہ سالار جنگ[24] اور ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد[25] میں اس کا ایک نسخہ محفوظ ہے۔ "مراۃ الحشر" کا واحد مکمل نسخہ کتب خانہ و ادارہ تحقیقات علوم مشرقی کا مخزونہ ہے[26]۔ کتب خانہ سالار جنگ کے نسخے میں آخر کے ۱۶ اشعار کم ہیں۔ ادارہ ادبیات کا نسخہ ناقص الطرفین ہے، جس میں ابتدا کے کم از کم ۱۴۰ اور آخر کے ۱۵ اشعار غائب ہیں۔ انجمن ترقی اردو کراچی کے مخطوطے (۳/۲۵) میں ابتدا کے ۶۸ اور اختتام کے ۸ اشعار نہیں ہیں[27]۔ مخطوطات انجمن ترقی اردو[28] کی چھٹی جلد میں اس مثنوی کے ایک اور مخطوطے کا حوالہ دیا گیا ہے لیکن ابتدا اور اختتام کے اشعار درج نہیں کئے گئے۔ کتب خانہ و ادارۂ تحقیقات علوم مشرقی کا دوسرا نسخہ[29] ناقص الاول ہے اور اس میں ابتدا کے آٹھ شعر کم ہیں۔

جہاں تک "مراۃ الحشر" کی تاریخ تصنیف کا تعلق ہے فراقی نے درج ذیل اشعار میں اس کتاب کی تاریخ تصنیف بیان کی ہے:

کیا قصد تاریخ جب بولنا
یو اجمال تفصیل کر کھولنا

---

[24] نصیر الدین ہاشمی۔ فہرست مخطوطات کتب خانہ سالار جنگ حیدرآباد (مخطوطہ ۳۱۶) ص ۴۶

[25] مراۃ الحشر (قلمی) کا ایک نسخہ جناب زمن راج سکینہ نے حال ہی میں ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد میں داخل کیا ہے (مخطوطہ ۲۱۰۴)

[26] مخطوطہ ۶۱ جدید [27] مخطوطات انجمن (کراچی) جلد پنجم ص ۲۸۰ [28] ایضاً (جلد ۶) ص ۴۶ [29] نصیر الدین ہاشمی کتب خانہ

توجہ دل کیا اس وزا نتخاب
یو دیکھو جو ہے بابرکت کتاب

۱۱۳۲ھ

چوں کہ فراقی نے یہ مثنوی ۳۶ سال کی عمر میں لکھی ہے اس لیے اس سے ۱۰۹۶ھ ان کی تاریخ پیدائش برآمد ہوتی ہے۔ "مراۃ الحشر" تین ہزار نوسو پچپن (۳۹۵۵) اشعار پر مشتمل ہے اس مثنوی کو شاعر نے ۲۳ ابواب میں تقسیم کیا ہے[۳۰] ہر باب کا آغاز ایک شعر سے ہوتا ہے۔ تمام ابواب کے ابتدائی اشعار جو بطورِ عنوان درج کیے گئے ہیں ایک ہی بحر اور قافیے کی پابندی کرتے ہیں اگر ان اشعار کو یک جا کیا جائے تو ۲۳ اشعار پر مشتمل ایک قصیدہ بن جائے گا۔ جس کے مطالعے سے پوری مثنوی کا لب لباب سامنے آجاتا ہے۔ مثنویوں کے ابواب میں عنوانات کے اہتمام کا یہی انداز ابنِ نشاطی کی "پھول بن" نصرتی کی "علی نامہ" اور ہاشمی کی یوسف زلیخا وغیرہ میں بھی نظر آتا ہے۔ "مراۃ الحشر" کے چند منظوم عنوانات درج ذیل ہیں:

یو خدا کی ہے حمد کا مذکور
ذات اس کی جو فہم تے ہے دور[۳۱]

اب مناجات کوں لیسا دیا ہات
تا کرے حق گنہ مرے مغفور[۳۲]

یو محمدؐ کی نعت کا ہے بیان
ہوئی خدائی تمام، جس کی ظہور

غوث الاعظم کے یو مناقب ہیں
جس کو معشوق اپیں کیا ہے غفور

وصف سیّد محمدؐ کامل
رہے مدینے میں چھوڑ بیجاپور

۳۰؎ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس مثنوی کے ابواب کی تعداد ۲۲ بتاتی ہے دیکھیے تاریخ ادب اردو جلد اول ص ۵۶۱

طبع کی یو بیان جودت کا
جس سبب یو کتاب ہوئی مسطور
یو سن حال گوش عبرت سوں
ہے نصیحت بیانِ اہلِ قبور
یو قیامت کی دس علامت ہیں
ہر علامت کریں گی جگ میں ظہور
یو ہے دجّال کا بیان سارا
تھا وہ بدبخت کافرِ مقہور
یو ہے مذکور حشر کا سارا
خلق اُٹھے گی تمام یوم نشور
پند فرزند سوں ہے نیکی تو
سب محبّاں کوں نی ہے یو نخ نرود
ختم ساری کتاب کا یو ہوا
یا رب اس کوں مدام کر منظور [۴۴]

قدیم اردو کی دوسری مثنویوں کی طرح "مرآۃ الحشر" کا آغاز بھی حمد مناجات، نعت، اور منقبت سے ہوتا ہے۔ فراقی نے حمد میں ۵۶" مناجات میں ۵۸ اور نعت میں ۱۰۷ اشعار لکھے ہیں۔ ذیل کے اشعار سے ان کی قادرالکلامی اور شاعرانہ کمال کا اندازہ ہوتا ہے۔

حمد : کہوں حمد ہور شکر اس رب کے تئیں
جلاتا ہے ہور مارتا سب کے تئیں

---

۲۴ تا ۴۴ یہ تمام اشعار کتب خانہ و ادارۂ تحقیقات علوم مشرقی حیدرآباد کے قلمی نسخے (مخطوطہ ۶۸ جدید) سے اخذ کیے گئے ہیں۔

جِلانا تو اُس پر نہ دشوار ہے
نہ کچھ مارنے کوں اسے بار ہے
ہویدا کیا پَل میں دونوں جہاں
او پیدا کیا ہے زمیں آسماں
صفت خالقیت کی دھرتا ہے او
جو کچھ من منگیا سوچ کرتا ہے او

مناجات

الٰہی تو ہے عاصیاں کا کریم
حلیمؔ، قدیمؔ، غفورؔ، رحیم
تو مالک دلاں کا ہے روشن ضمیر
سمیعؔ، علیمؔ، خبیرؔ، بصیرؔ
تو قادر ہے سب قدرتاں کا دھنی
حکیمؔ، جوادؔ، قویؔ، غنی
ترے سوں ہے اُمید سب کوں یقیں
رؤفؔ، رحیمؔ، حمیدؔ، متین

نعت

محمدؐ نبی سیّد المرسلیں
رسولِ خدا شافع المرسلیں
یو تیرے سبب سوں یو خلقت ہوا
یو تیرا قدم جگ پہ رحمت ہوا
شفاعت کے توں برج کا آفتاب
کرم کے گگن کا سچا ماہتاب

شہنشاہ تو انبیا کا تمام
تو پایا ہے محمود سا خوش مقام

حمد و مناجات اور نعت کے بعد مناقبِ غوث اعظم کا انداز بھی ملاحظہ کیجیے۔

زباں مشکِ از فرسوں پرور دہ کر
کہوں حمد میں غوث الاعظم اوپر
مرادیں کا رہنما پیر ہے
ولایت کا قطب جہانگیر ہے
پکڑ ہات مجھ کوں دکھایا خُدا
خُدا بو ہتنے اس کا پایا سدا
محمد نبی انبیا میں ہے جیوں
محی الدین سب اولیاں میں ہے دوں

اس کے بعد فراقی نے اپنے دادا سیّد محمّد قادری (متوفی ۱۰۱۵ھ) کی تعریف میں ۶۵ شعر کہے ہیں۔ چند شعر دیکھیے:

اتا تانوں سیّد محمّد کا لیوں
قدم پر تے جیو اس کے قربان دیوں
محی الدین کے پاس لیایا مجے
غلاماں میں تس کے بلایا مجے
اسے دستگیری کی قدرت اتھی
خدا کے دکھانے کی جرأت اتھی
محمدؐ کا ان خلق دھرتا اتھا
نپٹ علم کے گنج بھرتا اتھا

سیّد محمّد قادری مدرّس کا شمار بیجاپور کے اُستاد الاساتذہ میں ہوتا تھا۔ انہوں نے

بیجاپور میں اپنے وقت کے مشہور عالم قاضی سید علی محمد کے آگے زانوئے ادب تہہ کیا[۳۴] سید محمد مدرس کو دو[۲] بار حج کی سعادت نصیب ہوئی۔ ایک حج کے موقع پر انہوں نے سید صبغۃ اللہ حسینی کے خلیفہ شیخ عبد العظیم مکی کے ہاتھ پر بیعت کی اور خرقۂ خلافت بھی پایا۔ ۵ رجب ۱۰۸۳ھ کو انہوں نے ہجرت کا ارادہ کیا مدینہ منورہ پہنچ کر گنبدِ خضرا کی زیارت کی اور نماز شکرادا کرکے واصل بحق ہوئے[۳۵] (۲۴ شوال ۱۰۸۵ھ) سید محمد مدرس کے علم و فضل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فراقی کہتے ہیں۔

اتھا علم سوں وارثِ مصطفیٰ
تو سیّد محمّد مدرس ہوا
بڑا پایا اپس کی وہ شانِ رفیع
بسایا اپیں جا زمین بقیع
اسے بھوت عشقِ پیمبر ہوا
مدینے میں ہمسایہ جاکر ہوا
اتھے نعمتاں علم کے بے شمار
کریں رات دن مستحقاں پہ بار
او دیتا تھا جیوں ابرِ نیساں شرف
او لیتا تھا دریا ہو چاروں طرف

اپنے دادا سیّد محمد قادری کی مدح کے بعد فراقی "مراۃ الحشر" کے سبب تالیف کو موضوعِ سخن بناتے ہوئے کہتے ہیں:

وہی ہے جہاں میں عجب بخت ور
موئے یار ہیں جگ میں ہوکر امر

۳۴۔ بجھتے چراغ ص ۱۵۶ ۳۵۔ ایضاً ص ۱۵۶

جہاں لگ رہے یو گگن ہور زمیں
اچھے ناؤں اس کا تو یس جانشیں

آگے چل کر کہتے ہیں کہ اگرچہ کہ نوشیروان اب دنیا میں نہیں رہا لیکن اس کا نام عدل کی وجہ سے زندہ ہے۔ لیلیٰ مجنوں، یوسف زلیخا، منوہر اور مدمالتی کو فوت ہوئے زمانہ گزر گیا لیکن عشق کی وجہ سے ان کا نام باقی ہے۔ اسی طرح قدیم اردو کے عظیم المرتبت شاعروں نصرتی اور حسن شوقی کو یاد کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انہیں سخنوروں کے کارہائے نمایاں کو دیکھ کر مجھے بھی اشتیاق پیدا ہوا کہ میں بھی اپنی کوئی تصنیف یادگار چھوڑ جاؤں :

اگرچہ وہ نوشیرواں مر گیا
و لے عدل سوں ناؤں جیتا رہا
قرن گزرے مجنوں کی ہو کر وفات
سچ عشق جیوں ناؤں پایا حیات
نکل گئے ہیں یوسف زلیخا و لے
رہیا ناؤں ان کا نو گئے و لے
اد مر گئے ہیں چیار چندر بدن
رکھے نام پر عشق میں کر جتن
گیا نصرتی بول میٹھا بچن
رہیا ناؤں ہو کر جواہر کا کھن
کہ شوقی اتھا بھوت ایس شوق کا
کتا تھا سخن بے بہا ذوق کا

فراقی کے آبا و اجداد میں اگرچہ متعدد اہل علم علمائے و فضلا گزرے ہیں لیکن کوئی شاعر نہیں ہوا۔ وہ کہتے ہیں کہ اپنے خاندان میں میں ہی ایک ایسا فرد ہوں جو کسی بھی فن میں ماہر نہیں۔ لیکن مجھے لڑکپن کے زمانے سے "شیریں کلام" سے رغبت رہی ہے۔

نہ شاعر ہوا کوئی مری پشت میں
ہُنر یو رکھا نیں کوئی مشت میں
اتھے فاضلاں سارے میرے بڑے
علم علم کا لے کے جگ میں کھڑے
ہوا مینچہ پن سب میں ایسا خراب
جو یک بات پوچھے تو نا دیوں جواب
نہ کیں ایک فن میں چ ماہر ہوں ہیں
ہر اِک بات میں خوب جاہل ہوں میں
اتھی پن یہ کھنوادگی تے ہوس
بچن خوب سُننے کا مجہ کان رس

فراقی کی زندگی کا بیشتر حصہ فارسی گوئی میں گزرا انہوں نے محض منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے کبھی کبھار دکنی اردو میں بھی طبع آزمائی کی ہے اسی لیے انہوں نے اپنے دکنی کلام کو محفوظ رکھنے کی کوشش بھی نہیں کی۔

مری عمر سب فارسی میں سری
کہوں شعر دکنی تو میں سرسری
لکا دے وقت جیب میں کھولتا
یو دکنی بچن گاہ گہہ بولتا
نپٹ کم کیا ہوں میں دکنی بچن
رکھیا نیں ہوں اتنے کوں بی کرجتن

جب ان کی نظر انتخاب احوال قیامت پر مبنی فارسی کتاب "آخرت نامہ" پر پڑی تو انہیں اس کتاب کو دکنی میں ترجمہ کرنے کا خیال آیا۔ اس سلسلے میں انہوں نے اس موضوع سے متعلق دیگر کتابوں کا بھی بہ نظر غائر مطالعہ کیا۔ احادیث اور آیتیں

مومناں کا ہے ایو، نزاع دو داع
جو د سے حال انوں کی جک کے حضور

"مراۃ الحشر" میں جیسا کہ فراقی نے مختلف ابواب میں واضح کیا ہے، نزع کی کیفیت، بیانِ اہلِ قبور، یومِ حشر کا تذکرہ، قیامت کی دس علامتیں، دجال اور یاجوج ماجوج کی فتنہ انگیزی اور حضرت مہدی اور عیسٰی کا ظہور، پل صراط اور جزا و سزا کی تفصیل بیان کر کے نیکی اور عملِ صالح کی تلقین کی گئی ہے۔

جہاں تک فراقی کی دیگر منظومات کا تعلق ہے، مولوی نصیرالدین ہاشمی نے "دکن میں اردو" میں (۶) اشعار پر مشتمل ایک نعت شائع کی ہے، جس کا مطلع اور مقطع اس طرح ہے:

مدینے میں اگر پیدا ہوا ہوتا تو کیا ہوتا
محمد کی گلی بھیتر فنا ہوتا تو کیا ہوتا
نظر ہے علم منطق ہور معانی میں فراقی کوں
اگر علم حدیث مصطفیٰ ہوتا تو کیا ہوتا[۳۷]

کتب خانہ سالار جنگ کی ایک بیاض[۳۸] میں "نظم فراقی" کے عنوان سے ایک نعت ملی ہے۔ مولوی نصیرالدین ہاشمی نے اسے ۴۸ شعر کی نظم بتایا ہے۔ حالاں کہ یہ ۲۴ اشعار کی نعت ہے۔ جس کے ہر مصرعے کو کاتب نے ایک شعر کی طرح دو حصوں میں نقل کیا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

ہمیشہ مجھ سے عاصی کوں، نبی جی آسرا تیرا
جہنم کے خلاصی کوں، نبی جی آسرا تیرا

۳۷؎ دکن میں اردو۔ ۱۹۶۳ء۔ صفحہ ۳۷۶۔

۳۸؎ فہرست مخطوطات کتب خانہ سالار جنگ صفحہ ۳۹۶

اندھارا مجہ کوں نا سوجے کہ دن اور رات نا بوجے
ولے نس دن یو جاجے، نبی جی آسرا تیرا (کذا)
گنہ تے ہات دھوتا ہوں، بدی سوں عمر کھوتا ہوں
ولے نس دن یو روتا ہوں، نبی جی آسرا تیرا
صراط اوپر جو جانا ہے، بدی اپنی ستانا ہے
اے مکہ حق کوں دکھانا ہے، نبی جی آسرا تیرا
ہوس میں شادمانی کی، گئی مستی جوانی کی
نہ حسرت زندگانی کی، نبی جی آسرا تیرا
گنوایا رات سونے میں، سو غفلت کے بچھونے میں
کہ پڑیو خاک جینے میں، نبی جی آسرا تیرا
تو ساقیِ حوضِ کوثر کا، ملاقی ہور ہر نہر کا (کذا)
فراقی بھی ہے تج گھر کا، نبی جی آسرا تیرا

متذکرہ بالا نعتوں کے علاوہ فراقی کی ۹ غزلوں کا پتا چلتا ہے جن کی تفصیل یوں ہے۔

تذکرۂ مخطوطات ادارۂ ادبیاتِ اردو کی چوتھی جلد میں ڈاکٹر زور نے فراقی کی ۵ شعر پر مشتمل ایک غزل شائع کی تھی، جس کا مطلع اور مقطع یہ ہے[۳۹]

ہو آگے اگر جگ منیں یار گل کے
پچھیں گے اس سینے میں خار گل کے (کذا)
پریشان بلبل ہے صادق فراقی
نہ دیکھیا نیں آج دیدار گل کے

---

۳۹ ص ۲۸۲

مولوی افسر صدیقی امروہوی نے مخطوطات انجمن ترقی اردو کراچی کی پانچویں جلد میں ۵ شعر کی ایک غزل پیش کی ہے۔ مطلع اور مقطع درج ذیل ہے[۴۰]

جو ہے لٹکنا ڈولت اس دھن سر و بالی مینیں
سو کاں لطافت نازکی دونے کیری ڈالی مینیں
مالی فراقی ہو رہیا تج حسن کیرے باغ کا
یک دو کلیاں چن کرلیا تسد نار ہی حالی مینیں

ڈاکٹر جمیل جالبی نے تاریخ ادب اردو جلد اول میں فراقی کی آٹھ شعر پر مشتمل ایک غزل اور بعض غزلوں کے چیدہ چیدہ اشعار درج کیے ہیں۔ غزل کا پہلا اور آخری شعر ملاحظہ کیجیے:

سچے دنیاں کا کام نا لینا
بات سٹ کر یو جام نا لینا
اے فراقی سخن کی قیمت کوں
بس ہے تحسیں، دام نا لینا[۴۱]

مولوی اکبرالدین صدیقی نے "بجھتے چراغ" میں متذکرہ غزلوں کے علاوہ مزید چھ غزلیں شائع کی ہیں۔ جن کے مطلعے اور مقطعے ذیل میں درج کیے جاتے ہیں[۴۲]

فقیراں باوجودِ دست دیا بے دست و پا اچھا
انوں سب کی نظر میں، ان کی نظراں میں خدا اچھا
فراقی کے بچن سن کر کتے ہیں عارفاں اکثر
بھنور اکب کا چپ، حقیقت میں عطا اچھا (کذا)

---

۴۰ ایضاً ص ۲۸۱ ۴۱ ڈاکٹر جمیل جالبی تاریخ ادب اردو (جلد اول) ص ۵۶۱

۴۲ بجھتے چراغ ص ۱۶۴

فقیروں کو طمع کچھ نئیں جہاں کی کار سازی کا
کہ ہے صندوق میں دل کے خزانہ بے نیازی کا
فراقی پیر کے بھوں پے دسے تو فرض ہے سجدا
کہ جائز ہے ہونا لو قبلہ بے نمازی کا (کذا)

میں جان اچھوں مجہ دل کوں شوق اس گلبدن کا کھینچتا
بلبل کے دل کو دام تھا رشتہ چمن کا کھینچتا
گم نام ہو گوشے میں رہوں چاہے فراقی بہوت پچ
پن کیا کرے میدان میں شہرت سخن کا کھینچتا

عاشقاں کوں نہ چپ خرید کیا
کر کے قرباں اپس لو عید کیا
فکر اس کو ہے سب فراقی کی
آپ جے کوئی ملا مرید کیا

لذّت جو کوئی پایا اچھے تجہ عشق کی تروار کا
یک وار بیٹھے نیچ تک مشتاق دوسرے وار کا
پل میں فراقی ہوش جا مجلس کی مجلس مست ہو
دور آ بھرے جس بزم میں جام (رخ دیدار کا)

دلاں کو بیچ دینے کا عجب لٹکا ہے تجہ لٹ کا
فراقی پیو کے لب پر ایک کب تک بچاوے جیو (کذا)
خطر نئیں تو سکندر ہو بڑا ہے کام کھٹ کھٹ کا

فراقی کی غزلوں میں اشعار کی تعداد ۵، ۷، ۹، ۱۱ اور ۲۲ سے ۴۵ تک ہے۔ ان کی بعض غزلوں کی زمین میں ولی، فائز اور آبرو نے بھی غزلیں کہی ہیں۔ فلسفہ و تصوّف، درویشی اور عزلت نشینی، پند و نصائح، عجز و انکساری، قناعت پسندی، ہوس و طمع سے

نفرت، نیکی و سچائی اور اعلیٰ و ارفع اقدار کو اپنانے کی تلقین فراقی کی غزل گوئی کا سب سے نمایاں اور اہم موضوع ہے چند شعر پیش کیے جاتے ہیں۔

فقیراں باوجودِ دست ویا بے دست و پا اچھا
انوں سب کی نظر میں، ان کی نظراں میں خدا اچھا
ملو گر زہر، بریاں یا جواری کی سُکی روٹی
جو کچھ حق کی عنایت ہے اسی پر اکتفا اچھا
جتی جس تے بدی ہوئی تو وُتی نیکی بجالیا نا
اپھے کوئی سخت آہن تو اپیں آہن رُبا اچھا
فقیروں کوں طمع کچھ نئیں جہاں کی کارسازی کا
کہ ہے صندوق میں دِل کے خزانہ بے نیازی کا
شکر کرنا جو کچھ دیا سو خدا
منّتِ صبح و شام نا لینا
پھوڑ شیشہ پتھر پو، جام پچھاڑ
اے حلالی، حرام نا لینا

فراقی کی غزل کا دوسرا پہلو، عشق و محبّت کے جذبات کی ترجمانی، محبوب کے سراپا کی تصویر کشی، وصالِ یار کی خواہش اور ہجر و فراق کی تڑپ کے روپ میں سامنے آتا ہے۔ طرزِ ادا کی ندرت، جذبے کی شدّت، اور حسنِ تخیل کے سبب ان کے عشقیہ اشعار آج کے قاری کے لیے بھی باعثِ کشش معلوم ہوتے ہیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

ہمنا کے دِل کوں جس دم تم لے چلے پیارے
منہ تکتے رہ گئے یہ ہمدم سبھی بچارے
مجھے اے حسن کا ساقی لباں کا مے پلاتا نئیں
ارے ظالم میں مرتا ہوں تجے کچھ رحم آتا نئیں

موتیاں کیری جالی منیں دو پرکھ سو تیرے یوں دستیں
یارب یو کیا ہے معجزہ دو چاند یک جالی منیں
یں جاں اچھوں مجہ دل کوں شوق اس گلبدن کا کھینچتا
بلبل کے دل کوں دام بہار شتہ چمن کا کھینچتا
یو گھٹا آہ کے دھویں کا تیں
یں فلک آٹھواں جدید کیا
لذّت جو کوئی پایا اچھے تج عشق کی ترزوار کا
یک وار بیٹھے رنج لگ مشتاق دُسرے وار کا



یہ فرمائش مولانا راہی قدائی مطبوعہ
(۱) سب رس۔ حیدرآباد جنوری ۱۹۹۱ء
(۲) نغیر۔ ویلور ۱۹۹۲ء

ولی کی شمالی ہندوستان کو دین

ولی محمد ولی دکنی (متوفی ۱۷۲۰ء - ۱۷۲۵ء)[1] قدیم اردو کا ایک باکمال اور عظیم المرتبت شاعر ہے۔ اس کے مقام پیدائش کے بارے میں، محققین میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس شاعر نے، آنے والے زمانے میں اردو شعر و سخن کے دھارے کو موڑتے ہیں جو عظیم رول انجام دیا ہے۔ اس کی وجہ سے اردو زبان و ادب کے بعض محققین نے، اس کو اپنے مخصوص صوبوں سے منسوب کرنے کی کوشش کی۔ ولی کے بچپن کے واقعات حیات پر تاریکی کا پردا پڑا ہوا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ لڑکپن اور نوجوانی کے زمانے میں انھوں نے کچھ عرصہ گجرات اور خاص طور پر احمد آباد میں قیام کیا تھا۔ اس واقعہ کا ذکر ان کے کلام میں ملتا ہے۔ شہر سورت کے متعلق ایک مثنوی بھی ان کے دیوان میں موجود ہے۔ احمد آباد اور سورت کے حوالوں کی

---

[1] ڈاکٹر جمیل جالبی - تاریخ ادب اردو (جلد اول) ص ۵۳۹

وجہ سے گجرات کے بعض اہلِ علم نے اس بات کا ادّعا کیا ہے کہ ولی کا وطن گجرات ہے اور نوجوانی کے زمانے میں وہ اورنگ آباد آئے اور یہیں بس گئے۔ اس کے برخلاف زمانہ قدیم کے مورخین اور محققین سے لے کر ڈاکٹر جمیل جالبی تک اس امر پر متفق ہیں کہ ولی اورنگ آباد میں پیدا ہوئے ان کا بچپن اسی شہر میں گذرا۔ اگرچہ نوجوانی کے زمانے میں انھوں نے گجرات کا سفر ضرور کیا ہو گا۔

ولی کی شاعری کی فضا بنیادی طور پر دکنی شاعری کی فضا ہے۔ اس نے نہ صرف دکنی شاعری کی روایات اور رجحانات کی پاسداری کی ہے بلکہ دکن کے عظیم المرتبت شاعروں سے استفادہ کرتے ہوئے ان تمام زمینوں میں غزلیں بھی کہی ہیں، جن میں محمد قلی، غواصی، حسن شوقی، نصرتی، شاہی وغیرہ نے دادِ سخن دی ہے۔ چند شعر دیکھئے ؎

محمد قلی قطب شاہ : خبر لیایا ہے ہُدہُد میرے تیں اس یار جانی کا
خوشی کا وقت ہے ظاہر کروں راز نہانی کا

ولی : الٰہی رکھ مجھے تو خاکِ پا اہلِ معانی کا
کہ کھلتا ہے اسی صحبت سے نسخہ نکتہ دانی کا

غواصی : عاشق ہے جن تجہ لال کا اس مال و دھن سوں کیا غرض
ہے کام تس کوں روح سوں اس کوں بدن سوں کیا غرض

ولی : تجھ زلف کے بیتاب کوں مشکِ ختن سوں کیا غرض
تجھ لعل کے مشتاق کوں کان یمن سوں کیا غرض

نصرتی : پکڑیاں ہیں دھیان انکھیاں جو ترا مکھ تجھانے کا
آخر سبب کیاں ہے اپس گھر ڈوبانے کا

ولی : عبث غافل ہوا ہے گا فکر کر پی کے پاتے کا
صفا کر آرسی دل کی سکندر ہو زمانے کا

حسن شوقی : تجھ مکھ کنول کنولے پدل جگ میں سورنگ لالا ہوا
تجھ زلف تھے اپچے بھنور دوجے بھجنگ کالا ہوا

شاہی : تجھ بھال کے پرتاب تے پیدا چندر پالا ہوا
سندر گلے میں ہانس تجھ جیوں چاند کوں ہالا ہوا

ولی : تجھ مکھ پہ پوتل دیکھ کر لالے کا دل کالا ہوا
تجھ دور خط سوں طوق جیوں مہتاب کا ہالا ہوا

شاہ سلطان: من سیتے جب سوں نکل آیا اوپر آفتاب
تب تے صفالے ہوا زیر و زبر آفتاب

ولی : کیوں ہو سکے جہاں میں ترا ہم سر آفتاب
تجھ حسن کی اگن کا ہے ایک اخگر آفتاب

ہاشمی : سنگاتی سات نین میرا مو اسنگار کیا کرنا
مستی ہور پان خوشبوئی پھولوں کے ہار کیا کرنا

ولی : براگی جو کہاتے ہیں اسے گھر بار کرنا کیا
ہوئی جو گن جو کوئی پی کی اسے سنسار کرنا کیا

قائم چاند پوری کے بیان کے مطابق ولی نے ۱۱۱۲ھ/م ۱۷۰۰ء میں دہلی کا سفر کیا تھا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ شمالی ہند میں فارسی کا سکہ چل رہا تھا۔ حکومت

اور سلطنت کی زبان فارسی تھی چوں کہ حکمرانوں کا رجحان فارسی کی طرف زیادہ تھا اور فارسی ہی کی سرپرستی اور قدر و منزلت کی جاتی تھی اس لیے شاعروں اور ادیبوں کا فارسی کی طرف جھکاؤ ایک فطری بات تھی۔ ولی کے سفر دہلی سے پہلے بھی شمالی ہند کے بعض شاعروں نے بول چال کی اردو میں تفریح طبع کے طور پر شعر گوئی کا آغاز کیا تھا، لیکن ان میں سے بیشتر حضرات بنیادی طور پر فارسی کے شاعر تھے اور محض منہ کا مزا بدلنے کے لیے کبھی کبھار اردو میں بھی شعر موزوں کر لیا کرتے تھے۔ شمالی ہند کے فارسی زدہ ماحول میں ولی نے جب اپنی اردو غزلیں سنائیں تو اہلِ شمال کو اس بات کا احساس ہوا کہ اردو میں، جسے وہ ایک کم مایہ زبان سمجھتے تھے، اتنی گہرائی، گیرائی اور قوتِ اظہار موجود ہے کہ اس میں ادب بھی تخلیق کیا جا سکتا ہے۔

ولی سے پہلے شمالی ہند کے اہلِ علم دکنی اردو کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے تھے، شاید اسی لیے قائم نے "اک بات لچر سی بزبان دکنی تھی" کہا ہے حالاں کہ ۱۶۰۵ء سے ۱۷۰۵ء تک گجرات اور دکن میں گجری اور دکنی ایک متمول ادبی زبان کی حیثیت سے منظرِ عام پر آ چکی تھی۔ ولی ایک طرف گجری اور دکنی زبان کی عظیم شعری روایات کا علمبردار ہے تو دوسری جانب اس کے کلام میں سفرِ دہلی کے اثرات بھی کارفرما نظر آتے ہیں۔ وہ اردو شاعری کے ایک ایسے دوراہے پر کھڑا ہے جہاں ایک طرف اردوئے قدیم کی عظیم شاہراہ اختتام کو پہنچتی ہے تو دوسری طرف شمالی ہند میں اردو شاعری کے ایک نئے باب کا آغاز ہوتا ہے۔

قیامِ دہلی کے زمانے میں ولی کی ملاقات اپنے زمانے کے مشہور عالم اور شاعر شیخ سعد اللہ گلشن (م ۱۱۴۱ھ / ۱۷۲۸ء) سے ہوئی۔ شاہ گلشن نے ولی کی توجہ فارسی کے موضوعاتِ شعر اور اسالیب کی طرف مبذول کروائی اور انہیں اپنے کلام کو عجمی شاعری کی روایات کے سرچشمے سے سیراب کرنے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ سفرِ دہلی اور شاہ گلشن سے ملاقات کا نقش ولی کے تخلیقی شعور پر دھیرے دھیرے گہرا ہوتا گیا اور بقول مصحفی جب ۱۱۳۲ھ / ۱۷۱۹ء میں ان کا دیوان دہلی پہنچا تو شمالی ہند کی فضائیں ولی کے نغموں سے

گو نجنے لگیں اور ان کے شعر بچے بچے کی زبان پر جاری ہو گئے۔ محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ

"جب دیوان ولی دلی پہنچا تو اشتیاق نے ادب کے ہاتھوں پر لیا، قدردانی نے غور کی آنکھوں سے دیکھا لذت نے زبان سے پڑھا، گیت موقوف ہو گئے۔ قوال معرفت کی محفلوں میں اس کی غزلیں گاتے بجاتے لگے۔ ارباب نشاط احباب کو سنانے لگے۔ جو طبیعت موزوں رکھتے تھے، انہیں دیوان بنانے کا شوق ہوا۔" [1]

ولی نے جب اپنا دیوان مرتب کر لیا تو ملک بھر میں اس کے چرچے ہونے لگے۔ کلام ولی کی شہرت اور مقبولیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ عہد قدیم ہی میں دیوانِ ولی کی وسیع پیمانے پر پذیرائی ہوئی تھی چنانچہ دیوان ولی کے قلمی نسخے نہ صرف ہندو پاک کے کتب خانوں کی زینت ہیں بلکہ یورپ اور امریکہ کی لائبریریوں میں بھی محفوظ ہیں۔ اکرام چغتائی نے اپنے ایک مضمون "دیوان ولی کے قلمی نسخے" [2] میں ولی کے دیوان کے ۱۱۸ نسخوں کا تذکرہ کیا ہے۔ ان مخطوطات کے علاوہ مشفق خواجہ نے اپنی کتاب "جائزہ مخطوطات اردو" [3] میں دیوان ولی کے مزید ۱۹ نسخوں کی نشاندہی کی ہے۔

ولی نے ریختہ کے روپ میں جنوب اور شمال کی شعری روایات کو ایک ادبی وحدت میں منسلک کر کے ایسا تاریخ ساز کارنامہ انجام دیا کہ تمام ہندوستان کے چھوٹے بڑے سبھی شاعروں نے اس کو اپنا استادِ سخن اور ادبی رہنما تسلیم کر لیا۔ یہی وجہ ہے کہ گجرات کے اشرف، اورنگ آباد کے سراج، داؤد اور فدوی، سندھ کے میر محمود صابر، مدراس کے قربی اور شاہ تراب اور دہلی کے شاہ حاتم، آبرو اور مبتلا، سے میر تقی میر تک سبھی شاعروں نے اپنے کلام میں ولی کا تذکرہ ایک ادبی رہنما کی حیثیت سے کیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔ اشرف گجراتی کہتا ہے۔

---

[1] آب حیات ص ۸۴ [2] سہ ماہی "اردو" کراچی جولائی، اکتوبر ۱۹۶۶ء [3] لاہور ص ۱۸

شعر کہنے میں ہے اشرف کوں ولی کا مرتبہ
اس سبب سب شاعراں صدق سوں اس کے مرید

سراج اورنگ آبادی کہتے ہیں۔

تجھ مثال اے سراج بعد ولی کوئی صاحب سخن نہیں دیکھا

داؤد کا شعر ہے۔

کہتے ہیں سب اہلِ سخن اس شعر کوں سن کر
تجھ طبع میں داؤدؔ ولی کا اثر آیا

فدوی دکنی کا بیان ہے۔

سخت مشکل ہے اے عزیزاں ہو شعر کہنا ولی کے مضموں کا

سندھ کے میر محمود صابر لکھتے ہیں ؎

سن ریختہ ولی کا دل خوش ہوا ہے صابر حقا نہ فکر روشن ہے انوری کے مانند

شاہ تراب مدراسی کہتے ہیں۔

پروانہ جل تراب ہوا سو عجب ہے کیا روشن چراغ دل سوں ولی کا سخن ہوا

حاتم دہلوی کا شعر ہے۔

حاتم یہ فن شعر میں کچھ تو بھی کم نہیں لیکن ولی ولی ہے جہاں سخن کے بیچ

آبرو کہتے ہیں۔

آبرو شعر ہے ترا اعجاز پر ولی کا سخن کرامت ہے

مبتلا نے ولی اور حسن شوقی کو اس طرح یاد کیا ہے ؎

ریختہ کہنے کے فن میں مبتلا کچھ ولی ہور شوقیا قیاسوں کم نہیں

میر تقی میر کا مشہور شعر ہے ؎

خوگر نہیں کچھ یوں ہی ہم ریختہ گوئی کے معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا

شمالی ہند کے شاعروں اور ادیبوں نے براہ راست ولی کا اثر قبول کیا۔

اہلِ شمال ولی کے لسانی اجتہاد سے بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ ولی زبان کا رمز شناس اور اصلاحِ زبان کا بہت بڑا محرک تھا۔ اس نے اپنے افکار کے ابلاغ و ترسیل کے سلسلے میں گجرات و دکن کی طویل ادبی روایت کو فارسی موضوعات، اسالیب اور طرزِ احساس سے ہم آمیز کر کے زبان و بیان کا ایک نیا اور اعلیٰ معیار قائم کیا جو سب کے لیے قابلِ قبول تھا۔ ولی نے فارسی شاعری کے موضوعات و مضامین تشبیہات و استعارات، روزمرہ و محاورے، تراکیب و ضرب الامثال سے دل کھول کر استفادہ کیا۔ فارسی کے بیسیوں اشعار کا بڑی خوبصورتی اور فنی مہارت سے اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔ فارسی اور عربی الفاظ اور تراکیب کو اردو میں داخل کر کے ولی نے اُردو لفظیات کے خزانے کو وسعت بخشی، چند تراکیب ملاحظہ ہوں۔

"شعلۂ آواز"۔ "شعاعِ آفتابی"۔ "پنجۂ خورشید"۔ "حسن حیرت بخش" "چشم گوہر بار"۔ "حسنِ شور انگیز"۔ "رشکِ ماہِ کنعانی" "خوبیٔ اعجازِ حسنِ یار" "سلطنتِ ملکِ قناعت"، گلِ داغِ الم۔ گوہرِ کانِ حیا۔ یوسف کنعانِ دل۔ مطربِ نغمہ ساز۔ موجِ بے تابیٔ دل۔ مطربِ نغمہ ساز۔

بعض مقامات پر ولی نے فارسی یا عربی الفاظ کے ساتھ ہندی یا ہندوی لفظوں کے امتزاج سے بھی، بڑی دلکش ترکیبیں تراشی ہیں۔ جس سے اس کی وسیع النظری اور ایک مخصوص لسانی میلان کا پتا چلتا ہے۔ اس قبیل کی چند ترکیبیں ملاحظہ کیجیے۔

"خنجرِ مژگاں کی باڑ"۔ "غمزہ آہو پچھاڑ"۔ "آبِ نین"۔ "شیریں بچن" "ساغرِ نین"۔ "چشم سجن"۔ "لٹ پٹی دستار"۔ "وعدۂ کل" وغیرہ۔

اسی طرح فارسی کے چند محاوروں کا اُردو روپ بھی ملاحظہ کیجیے۔

خوش آمدن = خوش آنا   ع   نہ جاؤں صحنِ گلشن میں کہ خوش آتا نہیں مجھ کو

روا داشتن = روا رکھنا   ع   رکھتا ہے کیوں جفا کو مجھ پر روا اے ظالم

آب کردن = آب کرنا   ع   اے ولی دل کوں آب کرتی ہے۔

نماز کردن = نماز کرنا   ع   کرتی ہیں تیری پلکاں مل کر نماز گویا

تماشا کردن = تماشا کرنا ع مجھ مکھ کا نور جب سوں تماشا کیا ولی

چشم داشتن = امید رکھنا ع چشم رکھتا ہوں اے سجن کر پڑھوں

بار یافتن = بار پانا ع ادب کے اہتمام آگے نہ پاوے بار وہاں ہرگز

گوش کردن = سننا ع یک بار میری بات اگر گوش کرے توں

جا کردن = مقام کرنا ع گوہر اس کی نظر میں جا نہ کرے

شیوہ گرفتن = طریقہ اختیار کرنا ع لیا ہے اس سبب دل نے مرے شیوہ گدائی کا

ولی سے پہلے فارسی الفاظ، تراکیب، روزمرہ، ضرب الامثال اور محاوروں کا ذخیرہ اس قدر بڑے پیمانے پر اردو میں منتقل نہیں ہوا تھا۔ ولی کے اس لسانی اجتہاد کی وجہ سے فارسی کے سینکڑوں الفاظ اور ترکیبیں اردو کے ادبی سرمایے کا حصہ بن گئیں اور اردو زبان فارسی شاعری سے آنکھ ملانے کے قابل ہو گئی۔ ولی کا یہ بیان محض شاعرانہ تعلی نہیں معلوم ہوتا ہے

یسار دل سوں اپس کے تو یاد خاقانی

ولی کوں دیکھ کہ اب رشکِ انوری ہے یہ

عرفی و انوری و خاقانی مجھ کو دیتے ہیں سب حسابِ سخن

دیوان ولی کے دہلی پہنچنے کے بعد ہی شمالی ہند میں باقاعدہ اردو میں شعر گوئی کی ابتدا ہوتی ہے۔ اہلِ شمال کو ولی کے ریختہ میں وہ تمام خوبیاں نظر آئیں جو ایک طویل عرصے تک فارسی شاعری کا طرّہ امتیاز سمجھی جاتی تھیں۔ دہلی کے سخنوروں کو پہلی بار یہ احساس ہوا کہ اردو میں بھی فارسی کے دواوین کی طرح دیوان مرتب کیے جا سکتے ہیں۔ دیوان ولی میں وہ تمام لوازماتِ شعر موجود ہیں جو فارسی شعرا کے ہاں پائے جاتے ہیں۔ جب انہوں نے ریختہ میں اعلیٰ درجہ کی شاعری کا مطالعہ کیا تو سب کے دل میں دیوان بنانے کی خواہش پیدا ہوئی۔ چنانچہ محمد شاہی دور میں اردو کے متعدد صاحبِ دیوان شاعروں کا پتا چلتا ہے۔ شمالی ہند میں

اردو شاعری کے دورِ اوّل کے کم و بیش تمام شعرا نے ولی کی غزلوں کو پیش نظر رکھ کر اس کے اتباع اور تقلید میں شعر کہنے کی کوشش کی ہے۔ محمد شاکر ناجی نے لکھا ہے ؎

سخن وہ ہے وہی جو صاحب دیوان ہو ناجی

نہیں یک فردیوں کی تاب یہ ممکن کہ شاعر ہو

اس شعر سے پتا چلتا ہے کہ ولی کے زیر اثر دہلی میں دیگر اصناف کے مقابلے میں غزل کو فوقیت حاصل ہو گئی ہے اور اسی شاعر کو بڑا سمجھا جانے لگا ہے، جس نے غزلوں کا دیوان ترتیب دیا ہو۔ شمالی ہند میں اردو شاعری کے دورِ اوّل کے تمام صاحبِ دیوان شاعروں کے کلام کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ یہ شعرا ولی کے دیوان کو نمونے کے طور پر سامنے رکھ کر اسی انداز اور اسی رنگ میں غزلیں کہہ رہے ہیں کم و بیش تمام شاعروں کے کلام میں ولی کی زمینوں میں غزلیں موجود ہیں یا قافیہ کی تبدیلی کے ساتھ ولی کی ردیفوں سے نئی زمینیں بنائی گئی ہیں۔ غرض شمالی ہند کے سخنوروں نے کلام ولی کے مختلف رنگوں میں سے کسی ایک رنگ کو لے کر اسی کو اپنا انفرادی رنگ بنا لیا ہے۔ اگرچہ ایہام گوئی ولی کی شاعری کی بنیادی خصوصیت نہیں ہے لیکن دہلی کے متعدد شاعروں نے صنعتِ ایہام کو ولی کے کلام کا نمایاں وصف سمجھا اور شہرت کے حصول کے لیے ایہام گوئی کو ضروری قرار دیا۔ بحیثیت مجموعی ایہام گو شعرا جیسے آبرو، ناجی، مضمون، حاتم، یکرو اور غیر ایہام گو شعرا جیسے فائز، بیتلا وغیرہ سبھی کے رنگ و آہنگ، طرزِ ادا اور فکر و احساس پر ولی کا اثر نمایاں ہے۔ بقول ڈاکٹر جمیل جالبی

"ولی ایک ایسا شاعر ہے، جس نے امکانات کا وسیع راستہ آنے والے شعرا کے سامنے کھول دیا اور جس پر چل کر اردو غزل وہاں تک پہنچ گئی جہاں وہ آج نظر آتی ہے۔ ولی کے بعد آنے والے شعرا نے غزل کو بنیادی صنف سخن کی حیثیت سے قبول کر لیا اور ولی کی غزل کے رجحانات اردو غزل کے بنیادی رجحانات بن گئے۔ یہ بات یاد رہے کہ آگے چل کر جتنے رجحانات نمایاں ہوئے وہ خواہ عشقیہ شاعری کا رجحان ہو یا ایہام پسندی کا، لکھنوی

شاعری کی خارجیت ہو یا مسائل تصوف کی شاعری ہو یا ایسی شاعری ہو جس میں داخلیت اور رنگارنگ تجربات کا بیان ہو یا اصلاح زبان کی تحریک ہو سب کا مبداء ولی ہے۔ ولی کا اچھا اتنا اثر ہے کہ اردو غزل نے جو رُخ بھی بدلا اس میں ولی ہی کو رہبر پایا۔" [۱]

ذیل میں آبرو۔ فائز۔ حاتم۔ ناجی۔ مبتلا۔ یکرو اور میر کے چند ایسے اشعار درج کئے جاتے ہیں جو ولی کی غزلوں کی زمین میں کہے گئے ہیں یا پھر جن کے موضوعات حیرت انگیز طور پر ولی کے مضامین سے ٹکراتے ہیں۔

ولی : پھر میری خبر لینے وہ صیاد نہ آیا — شاید کہ مرا حال اسے یاد نہ آیا

فائز : مجھ پاس کبھی وو قد شمشاد نہ آیا — اس گھر منے وو دلبر استاد نہ آیا

ولی : دل کوں گر مرتبہ ہے درپن کا — مفت ہے دیکھنا سری جن کا

فائز : دل گرفتار میرا موہن کا — ہے غنیمت درس سری جن کا

ولی : طالب نہیں مہر و مشتری کا — دیوانہ ہوا جو تجھ پری کا

ناجی : دیوانہ ہوں میں ایک پری کا — قصہ نہیں مہر و مشتری کا

یکرو : تجھ کوں ہے خطاب سروری کا — دوجا نہیں تیری ہمسری کا

فائز : تجھ سا نہیں زلف و خط پری کا — یہ تار ہے سحر سامری کا

ولی : روح بخشی ہے کام تجھ لب کا — دم عیسیٰ ہے نام تجھ لب کا

آبرو : مست دل ہے مدام تجھ لب کا — جام صہبا ہے نام تجھ لب کا

ولی : شغل بہتر ہے عشق بازی کا — کیا حقیقی و کیا مجازی کا [۲]

آبرو : جو کہ محرم ہو عشق بازی کا — دل سیں عاشق ہے جاں گدازی کا

یکرو : عشق ہے عشق پاک بازی کا — گو کہ ہو عالم مجازی کا

۱۔ تاریخ ادب اردو (جلد اول) ص ۵۵

۲۔ شاہ ابوالحسن قربی ویلوری نے اسی خیال کو اس طرح پیش کیا ہے۔

کیا حقیقی و کیا مجازی ہوئے — عشق کا کاروبار بہتر ہے

ولی : جلوہ گر جب سوں وو جمال ہوا نور خورشید پایمال ہوا

فائز : چودھواں اس چندر کا سال ہوا حسن میں بدر باکمال ہوا

حاتم : جس کے دل بیچ ترا خیال ہوا اس کوں جینا سجن محال ہوا

ولی : تجھ لب کی صفت لعل درخشاں سوں کہوں گا
جادو ہیں ترے نین غزالاں سوں کہوں گا

آبرو : بے تابیٔ دل آج میں دلبر سیں کہوں گا
ذرّے کی طپش ہر منوّر سیں کہوں گا

یکرو : تجھ قد کی ادا سرو گلستاں سوں کہوں گا
جادو بے نین نرگس بستاں سوں کہوں گا

ولی : وہ ناز ہور ادا میں اعجاز ہے سراپا
خوبی میں گل رخاں سوں ممتاز ہے سراپا

فائز : خوباں کے بیچ جاناں ممتاز ہے سراپا
انداز دلبری میں اعجاز ہے سراپا

ولی : وہ صنم جب سوں بسا دیدۂ حیران میں آ
آتش عشق پڑی عقل کے سامان میں آ

یکرو : گل کوں شرمندہ کرا شوخ گلستاں میں آ
لب سیں غنچے کا جگر خوں کرو مکاں میں آ

ولی : اے گل عذار غنچہ دہن ٹک چمن میں آ
گل سر پہ رکھ کے شمع نمن انجمن میں آ

فائز : اے خوب رو فرشتہ سیر انجمن میں آ
سرو روانِ حسن ہمارے چمن میں آ

ولی : خوب رو خوب کام کرتے ہیں یک نگہ میں غلام کرتے ہیں

فائز : جب سجیلے خرام کرتے ہیں — ہر طرف قتل عام کرتے ہیں

آبرو : نازنیں جب خرام کرتے ہیں — تب قیامت کا کام کرتے ہیں

یکرو : خوش قداں جب خرام کرتے ہیں — فتنہ برپا تمام کرتے ہیں

ولی : تجھ غمزۂ خوں ریز سوں لڑ کوں سکے گا
تجھ ناز ستمگر سوں جھگڑ کون سکے گا

یکرو : تجھ شوخ ستمگار سیں اڑ کون سکے گا
جب اُٹھ چلو دامن کوں پکڑ کون سکے گا

ولی : لیا ہے جب سوں موہن نے طریقہ خود نمائی کا
چڑھا ہے آرسی پر تب سوں رنگ حیرت فزائی کا

یکرو : ہوا ہوں شاہ میں ملک جنوں کی بادشاہی کا
رسائی نیں وہاں رائج ہے سکہ نارسائی کا

ولی : سجن تجھ انتظاری میں رہیں نس دن کھلی انکھیاں
مثال شمع تیرے غم میں رو رو بہہ چلی انکھیاں

یکرو : گدازِ آتشِ غم سیں ہوی ہیں بادلی انکھیاں
انجھو کے بھانت پانی ہو کے ماٹی میں رُلی انکھیاں

آبرو : سحر اوٹھ خواب سیں گلشن میں جب تم نے ملی انکھیاں
گئیں مندشرم سوں نرگس کی پیارے جوں کلی انکھیاں

ولی : میں عاشقی میں تب سوں افسانہ ہو رہا ہوں
تیری نگہ کا جب سوں دیوانہ ہو رہا ہوں

فائز : ہر آشنا سے اس بن بیگانہ ہو رہا ہوں
مجلس میں شمع رو کی پروانہ ہو رہا ہوں

ولی : یک بار مری بات اگر گوش کرے توں
ملنے کو رقیباں کے فراموش کرے توں

فائز : اے یار نصیحت کو اگر گوش کرے تو
یہ طور و طریق اپنے فراموش کرے تو

ولی : عارفاں پر ہمیشہ روشن ہے — کہ فنِ عاشقی عجب فن ہے
فائز : یار میرا میان گلشن ہے — عرقِ خوں پھول تا بہ دامن ہے
تاجی : ناگ زلف سیہ کا پر فن ہے — کہ مجھے ڈستے کا تیرا من ہے
ولی : جسے عشق کا تیر کاری لگے — اسے زندگی جگ میں بھاری لگے
فائز : تری گالی مجھ دل کوں پیاری لگے — دعا مری تجھ من میں بھاری لگے
ولی : تجھ بنا مجھ کوں بے قراری ہے — میری انکھیاں سوں اشک جاری ہے
فائز : دھوپ سایو کیوں تاری ہے — کرن سورج کی دو کناری ہے
تاجی : گل کوں تجھ رخ سیں شرمساری ہے — مونہہ تیرا غنچۂ بہاری ہے
ولی : دل کوں تجھ باج بے قراری ہے — چشم کا کام اشک باری ہے
فائز : تجھ بنا دل کو بے قراری ہے — دم بدم مجھ کو آہ و زاری ہے

حاتم : الفت کی مجھ کو پیارے تیری نگاہ بس ہے
گر بے بہیلے نہ ہووے تو گاہ گاہ بس ہے

آبرو : نالا ہمارے دل کے غم کے گواہ بس ہے
اپنے تئیں شہادت انگشتِ آہ بس ہے

تاجی : سوخرمنِ خطا و ایک برق آہ بس ہے
نامہ مرے عمل کا روے سیاہ بس ہے

ولی : نہ بوجھو خود بخود موہن میں اڑ ہے
رقیب روسیہ فتنہ کی جڑ ہے

یکرو : ترے سج پیچ ظالم کیا اکڑ ہے — مرے دل کوں بھی تمنا کی پکڑ ہے

ولی : قد میں تیرے کروو خوش خرامی ہے — جس سوں تجھ ناز کی تمامی ہے

فائز : مجھ کو تجھ نال اب غلامی ہے — اس غلامی سے نیک نامی ہے

ولی : کسی کی گر خطا اوپر ترے ابرو پہ چیں آوے
نہ سمجھا کر سکے تجھ کوں اگر فغفور چیں آوے

یکرو : ہے طالع سیں مجھ گھر ہر کر گر مہ جبیں آوے
شبِ ہجراں میں مجھ کوں صبح صادق کا یقیں آوے

ولی : حسن تیرا سورج پہ فاضل ہے — مکھ ترا رشکِ ماہِ کامل ہے

فائز : آج میری طرف وہ مائل ہے — دل سیتی درد ہجر زائل ہے

ولی : گرچہ طنّاز یار جانی ہے — مایۂ عیش جاودانی ہے

یکرو : عشق کی رمز ہم نے جانی ہے — دل منیں یاد یار جانی ہے

تاجی : مہ رخاں کی جو مہربانی ہے — یہ مدد مجھ پہ آسمانی ہے

ولی : سرودِ عشق گاویں ہم اگر وہ عشوہ ساز آوے
بجا دیں طبلِ شادی کے اگر وہ دلنواز آوے

یکرو : مبارک عید ہو ہم کوں اگر وہ جلوہ ساز آوے
کروں میں جان کو قرباں اگر وہ دلنواز آوے

ولی : مکھ ترا آفتاب محشر ہے — شور اس کا جہاں میں گھر گھر ہے

فائز : شور تیرا سبھی کے در در ہے — ذکر تیرا یہ شہر گھر گھر ہے

ولی : صحبت غیر موں جایا نہ کرو — درد منداں کوں کڑھایا نہ کرو

یکرو : نین سیں نین چرایا نہ کرو — کم نگاہی سیں ستایا نہ کرو

فائز : مست منداں کو ستایا نہ کرو — بات کو ہم سے درایا نہ کرو

ولی : ہوا ہے رشک چنپے کی کلی کوں — نظر کر تجھ قبائے صندلی کوں

یکرو : کر اے جاں دور دل سیں کاہلی کوں رواں ہو دیکھ چنچل کی گلی کوں

ولی : ناز مت کر تجھے ادا کی قسم بے تکلف ہو مل خدا کی قسم

فائز : بت پرستی نہ کر خدا کی قسم توڑ زنار مصطفےٰ[۴۱] کی قسم

ولی : ہشیار زمانے کے ترے مکھ پہ نظر کر
تجھ نیہ کے کوچے میں گئے ہوش بسر کر

فائز : اے کان ملاحت ٹک ادھر آ کے گذر کر
دل خستہ بیمار پر اب ایک نظر کر

ناجی : مت باغ میں اس چہرۂ گلگوں سیں گذر کر
اے شوخ ٹک ایک شوق سیں بلبل کے حذر کر

ولی : آیا تو کمر باندھ کے جب جور و جفا پر
میں جی کوں تصدق کیا تجھ بانکی ادا پر

فائز : ابرو نے تری کھینچی کماں جور و جفا پر
قرباں کروں سو جیو تیرے تیر ادا پر

ولی : گر چمن میں چلے وہ رشک بہار گل کریں نقد آب و رنگ نثار

فائز : گل ترے مکھ کی فکر میں بیمار جیو بلبل کا تجھ قدم پہ نثار

ولی : عشق بے تاب جاں گدازی ہے حسن مشتاق دل نوازی ہے

فائز : اے سجن وقت جاں گدازی ہے موسم عیش و فصل بازی ہے

ولی : ترے لب پر جو خط عنبریں ہے خط یاقوت سوں نقش نگیں ہے

فائز : مرے دل بیچ نقش نازنیں ہے مگر یہ دل نہیں یار و نگیں ہے

ولی : مکھ ترا آفتاب محشر ہے سوز اس کا جہاں میں گھر گھر ہے

حاتم : یار کا مجھ کو اس سبب ڈر ہے شوخ ظالم ہے اور ستمگر ہے

ولی : ہے بجا عشاق کی خاطر اگر ناشاد ہے غمزۂ خوں خوار ظالم بر سر بیداد ہے

حاتم : کاملوں میں یہ سخن مدّت سے مجھ کو یاد ہے
جگ میں بے محبوب جینا زندگی برباد ہے

ولی : مت تصوّر کرو مجھ دل کوں کہ ہرجائی ہے
چمن حسن پری رو کا تماشائی ہے

حاتم : خوبرویاں میں تجھے رتبۂ امرائی ہے
فوج عاشق ترے حسن کی مجرائی ہے

ولی : ترا مکھ ہے چراغ دلربائی عیاں ہے اس میں نورِ آشنائی

حاتم : نہ کر خوباں سے اے دلِ آشنائی کہ ان کا کام ہے گا بے وفائی

ولی : نشہ بخش عاشقاں وہ ساقی گلفام ہے
جسکی انکھیاں کا تصوّر بےخودی کا جام ہے

حاتم : اوس پری رو کا مجھے ہردم تصوّر کام ہے
جس تصوّر سیں دلِ بے صبر کوں آرام ہے

(احمد آباد کے سہ روزہ یوجی سی سیمینار (۱۹۹۱ء) میں پڑھا گیا)
مطبوعہ قومی زبان حیدرآباد فروری ۹۳ء

قطب شاہی عہد میں اُردو غزل کا نشو و نما

غزل اُردو شاعری کا سب سے اہم ادبی اور تہذیبی سرمایہ ہے اس لیے غزل کا مطالعہ دراصل ایک مخصوص تہذیب، ایک مخصوص معاشرتی نظام اور مخصوص تاریخی اور سماجی حالات کا مطالعہ ہے۔ بقول رشید احمد صدیقی۔

" ہماری تہذیب غزل میں اور غزل ہماری تہذیب میں ڈھلی ہے دونوں کو سمت و رفتار، رنگ و آہنگ، وزن و وقار ایک دوسرے سے ملا ہے یہی سبب ہے کہ ہماری تہذیب کی روح غزل میں اور غزل کی روح ہماری تہذیب میں بے نقاب نظر آتی ہے"

ہر زمانے میں لوگ غزل سے دلچسپی لیتے رہے ہیں اور ہر دور میں اس کے سر پر شہرت و مقبولیت کا تاج رکھا گیا۔ اردو میں شعر و ادب کی ابتدائی نشو و نما کا سہرا دکن کے سر ہے۔ دبستانِ دکن کے قدیم ادبی ورثہ میں اگرچہ کہ مثنوی کی صنف نہایت مقبول رہی ہے لیکن فارسی شاعری کے اتباع میں قدیم دکنی شعرا نے ابتدا ہی سے غزل پر بھی توجہ کی ہے اردو میں غزل کے

جدید غزل ص۱۱

اولین نقوش کب اُبھرنے شروع ہوئے اس کا قطعی طور پر تعین مشکل ہے ۔ بہمنی عہد کا وہ دور جس میں اُردو میں تصنیف و تالیف کی روایت پڑنی شروع ہوئی ' اُردو ادب کی تاریخ کا تاریک دور ہے اس عہد کی عام تاریخ کے بارے میں کافی مواد فارسی تاریخوں میں مل جاتا ہے لیکن قدیم تاریخیں بالعموم زبان اور شعر و ادب کی نشوونما کے تذکرے سے عاری ہوتی ہیں ۔ پھر یہاں تک اس دور کی اُردو شاعری کا تعلق ہے وہ ایک ایسی زبان کی شاعری ہے جو پہلی مرتبہ بولی کے مرحلے سے آگے بڑھ کر زبان کی منزل میں داخل ہو رہی تھی ۔ اس لیے فطری طور پر اس عہد کے مورخین یا مصنفین نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کی اُردو کی اولین تحریریں دنیا کی اکثر زبانوں کے اولین تحریری نمونوں کی طرح صوفیوں اور مذہبی رہنماؤں کی تحریریں ہیں ۔ لیکن حضرت بندہ نواز اور چند صوفیوں کے فوری بعد ہم کو اُردو میں ادبی کوششوں کے ابتدائی نمونے ملنے شروع ہو جاتے ہیں ۔ چنانچہ نظامی کی مثنوی " کدم راو پدم راو " اس سلسلہ کی ایک اہم مثال ہے پھر نظامی کے معاصرین میں مشتاق ' لطفی اور قریشی کے نام ملتے ہیں جن کی غزلیں قدیم اُردو غزل کے ابتدائی نمونوں میں شمار کی جاتی ہیں ۔

دبستانِ گولکنڈہ کے اوّلین غزل گو شاعروں میں فیروز ' محمود اور ملا خیالی کے نام قابلِ ذکر ہیں ۔ موخر الذکر شاعر کی صرف ایک غزل دستیاب ہوئی ہے اس لیے اس کی غزل گوئی کے بارے میں قطعی طور پر کوئی رائے قائم کرنا دشوار ہے البتہ فیروز اور محمود کی نو دریافت شدہ غزلوں سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ قدیم اُردو کے یہ دونوں شعرا اپنے عہد کے اساتذۂ سخن اور با کمال غزل گو بھی تھے ۔ محمد قلی قطب شاہ اپنے کلام میں شاید فیروز اور محمود کی سی روانی ' برجستگی اور جدّت طرازی دیکھ کر کہہ اٹھتا ہے کہ اگر فیروز اور محمود میرے کلام کو دیکھتے تو کوئی تعجب نہیں کہ وہ بے ہوش ہو جاتے ۔ ؎

اگر محمود ہور فیروز بے ہوش ہوئیں عجب کیا ہے
ہوئے رچ وصف نا کر سک ظہیر ہور انوری بے ہوش

قطب الدین قادری فیروز ابراہیم قطب شاہ کے عہد کا ایک نامور شاعر ہے ۔ وہ بیدر

کا متوطن تھا اور بہمنی سلطنت کے آخری زمانے میں اپنے مرشد حضرت مخدوم جی شیخ محمد ابراہیم (متوفی ۱۵۶۴ء) کی ایما پر گولکنڈہ آیا تھا[1] اس کی ایک مختصر مثنوی "پرت نامہ" کے علاوہ دو تین غزلیں اور بعض غزلوں کے چیدہ چیدہ اشعار دستیاب ہوئے ہیں۔ محمد قلی کے علاوہ وجہی اور ابن نشاطی نے فیروز کو استادِ سخن کی حیثیت سے یاد کیا ہے اور اس سے اپنے کلام کی داد چاہی ہے۔ مثلاً وجہی کہتا ہے۔

کہ فیروز آ خواب میں رات کوں	دعا دے کے چومے مرے ہات کوں
کہیا ہے توں یو شعر ایسا سرس	کہ پڑتے کوں عالم کرے سب ہوس
توں ایسی طرز دل تے پنجیا نوی	کہ مرے کریں سب تری پیروی

فیروز کی غزلوں کے مطالعے سے اس کی ادبی حیثیت کا اندازہ بہ آسانی ممکن ہے جیساکہ ڈاکٹر نذیر احمد اور پروفیسر مسعود حسین خاں کا خیال ہے کہ "پرت نامہ" کوئی ایسا بڑا ادبی نقش نہیں تھا جو فیروز کی استادی اور اس کے کمالِ فن کے شایانِ شان ہو[2]

فیروز کی غزل کی سب سے نمایاں خصوصیت اظہار بیان کی سادگی ہے۔ اس کا تصورِ محبوب مادی اور مجازی ہے۔ وہ غزل کو عورتوں سے باتیں کرنے کا ذریعۂ اظہار سمجھتا ہے۔ اگرچہ کہ اس کے کلام میں "ہندوی" اور "فارسی" اثرات کی دھوپ چھاؤں نظر آتی ہے۔ لیکن بحیثیت مجموعی "ہندوی" عنصر غالب نظر آتا ہے۔ زبان اور طرزِ ادا سے قطع نظر اس کے متخیلہ پر بھی مقامی عناصر کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔

چند شعر ملاحظہ ہوں۔

سرو قدرت سہاوے جو نوبہار بن میں	نازک نہال پنجیا اس جیو کے چمن میں
گوریاں سہیلیاں سب جگ کیاں بساریاں	جب سانولی سکھی سوں مائل ہوا دکھن میں

---

[1] سید محی الدین قادری زور "دکنی ادب کی تاریخ" ص ۱۸

[2] مسعود حسین خان ڈاکٹر "پرت نامہ" قدیم اردو جلد اول ص ۲۳۸

فیروزؔ جے حمد کا دیکھیں جمال صوری   ہر حال اس صنم کا آکھیں خیال من میں

فیروز کی طرح سید محمود بھی ابراہیم قلی کے عہد کا ایک بلند پایہ شاعر ہے۔ زمانہ مابعد کے شاعروں میں محمد قلی، وجہی اور ابن نشاطی نے اس کو قدیم اُردو کے ایک عظیم المرتبت شاعر کی حیثیت سے یاد کیا ہے محمود ایک پُر گو اور قادر الکلام شاعر تھا۔ اس نے اردو کے علاوہ پنجابی اور افغانی میں بھی شعر موزوں کیے ہیں لیکن صرف اُردو شاعری کی وجہ سے اس کو مقبولیت حاصل ہوئی۔ محمود نے غزل کے علاوہ جھولنا مرثیہ، کبت، قصّہ اور دوہرے بھی لکھے ہیں لیکن اس کے کلام کا بیشتر حصّہ غزلوں پر مشتمل ہے[۱] اس کے کلام کی ایک قلمی بیاض انجمن ترقی اردو کراچی کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔

محمود طبعاً ایک غزل گو شاعر ہے۔ اس کی غزل کا نمایاں وصف، روانی و برجستگی، سادگی و موسقیت ہے۔ اس کے کلام میں سادگی و پُر کاری کے ساتھ ساتھ حقیقت پسندی، تاثر اور سوز و گداز کا حسین امتزاج بھی نظر آتا ہے اس کی غزل "گفتگو بہ زبان" کے موضوعات تک محدود نہیں بلکہ مختلف مسائلِ حیات اور زندگی کے گونا گوں مشاہدات اور تجربات کی ترجمانی بھی کرتی ہے۔

جو قدم راکھے سبک ساری کی رہ میں جیوں حباب
نیں ہے لغزش پاؤں کوں اس کے اگر چلتا پر آب
آج ہور کل میں اپس کی زندگی نا گھال توں
جو توں کرنا ہے سو کر لے حق کے کاماں کوں شتاب

گر کان ہیں تج کوں ارے اس باغ میں غنچے سگل
کرتے سو جیباں ستی تلقین خاموشی تجے

---

[۱] جمیل جالبی ڈاکٹر "تاریخ ادبِ اُردو" جلد اوّل ص ۱۴۱

ہے بات یودو روز کا توشہ کمر کوں باند چل
مغرور ہو بیٹھا ہے کی اوپنچے طلا کاری پچھے

مملکتِ گولکنڈہ کا پانچواں فرماں روا سلطان محمد قلی قطب شاہ نہ صرف ایک عظیم الشان سلطنت کا رعایا پرور حکمراں، دکنی تہذیب وتمدن کا معمار، فنِ تعمیر اور رقص وموسیقی کا دل دادہ تھا بلکہ اردو فارسی اور تلگو کا ایک بلند پایہ اور خوش گو شاعر بھی تھا۔ اس کی قادرالکلامی اور موزونیِ طبع کا یہ عالم تھا کہ وہ ہر روز اسی طرح بے تکلفی سے شعر کہتا تھا جس طرح دریا میں روز موجیں اٹھتی ہیں لیکن نہ تو دریا کی روانی میں فرق آتا ہے اور نہ موجوں کا تلاطم کم ہوتا ہے وہ کہتا ہے ؎

صدقے نبی قطب شاہ یوں شعر بولے ہر دن
دریا کوں روز جوں ہے موجاب کا طلوع

محمد قلی نے کم وبیش تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے اس کے کلیات میں حمد، نعت، منقبت، عیدِ میلادالنبیؐ، شبِ معراج، شبِ برات، عیدِ رمضان، بقرعید، عیدِ غدیر، نوروز، بسنت، سالگرہ، جلوہ، کھیل، برسات، محلاتِ شاہی، یارہ پیاریاں وغیرہ موضوعات پر ۲۲۰ مسلسل غزلیں، ۲۷ ریختیاں، ۱۲ قصیدے، ۱۴ رباعیاں اور ایک نا تمام مختصر مثنوی شامل ہے رباعیوں اور مثنیوں کو چھوڑ کر اس کا تمام کلام غزل کے فارم میں ہے۔ محمد قلی اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر ہے جس کا کلام مکمل دیوان کی شکل میں دستیاب ہو سکا ہے۔

اس نے صنفِ غزل پر سب سے پہلے باقاعدہ توجہ کی ہے یہاں تک غزلوں کی تعداد اور تنوع کا تعلق ہے محمد قلی دکنی اسکول کا سب سے بڑا شاعر قرار پاتا ہے۔ غزل کے لیے حسنِ داخلی کیفیت اور خارجی ماحول کی ضرورت ہوتی ہے وہ محمد قلی کو میسّر تھا شاید اسی لیے غزل اس کی محبوب صنفِ سخن بن گئی۔ یہاں تک کہ اس کی وہ تخلیقات بھی جنہیں ہم نظم سمجھتے ہیں دراصل مختلف موضوعات کے تحت کہی گئی مسلسل اور مربوط غزلیں ہیں۔

لیا جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ کم و بیش یہی خصوصیات دکنی کے دوسرے کلاسیکی شعرا کے ہاں بھی پائی جاتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہر شاعر کچھ نہ کچھ اپنی انفرادی خصوصیات کا حامل ہوتا ہے لیکن بحیثیت مجموعی بعض نمایاں خصوصیات تمام دکنی شعرا میں مشترک نظر آتی ہیں۔ سادگی روانی اور برجستگی دکنی شاعری کی وہ نمایاں خصوصیت ہے جو ۱۷۰۰ء کے بعد شمالی ہند میں نشوونما پانے والی شاعری میں تدریجی طور پر کم ہوتی گئی ہے۔ مرزا جانِ جاناں مظہر کی تحریک کے بعد شمالی ہند کے شعرا کا اظہارِ بیان بتدریج فارسی طرزِ نگارش سے متاثر ہونے لگتا ہے۔ سترہویں صدی عیسوی کے فارسی ادب پاروں میں صنعت کاری کا رجحان بہت زیادہ تھا، صنایع بدایع کا اہتمام، دوراز کار تشبیہات، استعارات اور تلمیحات کے ذریعے بات کو زیادہ پُرپیچ بنا دینے کا میلان فارسی شعر و ادب کے اہم عناصر تھے۔ اس کے برعکس محمد قلی یا قدیم اُردو کے دوسرے شعرا کا یہ رجحان قابلِ ستائش ہے کہ انھوں نے فارسی کی مروجہ روایت سے انحراف کرتے ہوئے، مرصّع اور پُرپیچ کی جگہ سادہ اور رواں اظہار بیان اپنایا۔ محمد قلی کی شاعری میں شاید ہی کوئی مقام ایسا ملے گا جہاں اس نے صنایع بدایع کے التزام کی کوشش کی ہو۔

محمد قلی کی غزلوں میں سوز و گداز ہے اور نہ فکر کی گہرائی، درد و غم کی فراوانی ہے اور نہ تشنگیٔ حسرت۔ اس نے اپنی زندگی کی بہاریں عیش و نشاط اور راگ رنگ میں گذاریں، اس لیے اس کے کلام میں رنگینی و رعنائی ہے۔ تازگی و شگفتگی ہے۔ سیرابی و سرمستی ہے۔ غرض آسودگی کے تمام روپ اس کے کلام میں جلوہ گر ہیں۔ محمد قلی کا آرٹ کلاسیکی آرٹ کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ خوشحالی، اطمینان اور آسودگی کا آرٹ ہے چونکہ وہ ایک عظیم الشان سلطنت کا مطلق العنان بادشاہ تھا اس کے محلوں میں بیسیوں ملکوں کی منتخب حسینائیں موجود تھیں اس لیے اس کی تمناؤں اور آرزوں کے آسودہ نہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

محمد قلی کی غزل کی دوسری نمایاں خصوصیت، واقعہ نگاری یا حقیقت پسندی ہے۔ اس نے اپنے احساسات، مشاہدات اور تجربات زندگی کو سادگی اور حقیقت پسندی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ محمد قلی یا دکن کے دوسرے شعرا کا تصورِ محبوب اُردو شاعری میں ایک منفرد حیثیت کا حامل ہے یہ محبوب تصوری و خیالی پیکر نہیں بلکہ اسی عالم رنگ و بو میں رہنے بسنے والا گوشت پوست کا

انسان ہے محمد قلی نے برملا انداز میں اپنے محبوب کو سکی، سہیلی، دھن، سودھن، یار، ناری، سندری، ننھی، سانولی، پیاری، چھبیلی، گوری، کنولی، موہن، مشتری، ہندی، چھوری، پدمنی وغیرہ ناموں سے یاد کیا ہے وہ ایک کثیر المحبوب شاعر ہے اس نے اپنے کلیات میں اپنی ان گنت محبوباؤں کی تعریف و توصیف میں سینکڑوں غزلیں لکھی ہیں۔

محمد قلی ہندوستانیت کا بہت بڑا پرستار ہے۔ اس کی رگ و پے میں ہندوستان کی تہذیب سرایت کر گئی ہے۔ وہ ایک تلنگن عورت "بھاگیرتی" کے بطن سے تھا، اتحاد پسندی اور رواداری اسے ورثے میں ملی تھی اسے ہندوستانی مزاج سے وہی مناسبت تھی جو امیر خسرو یا اکبر اعظم کو حاصل تھی، اس نے اسلامی عیدوں کے ساتھ ساتھ بسنت، نوروز، ابر برسات، دیوالی وغیرہ خالص ہندوستانی تہواروں کو بھی ایک بین قومی تقریب کی حیثیت سے رائج کیا۔ اس کا کلام اس کے ماحول اور اس کی رنگارنگ شخصیت کا آئینہ دار ہے۔

چند شعر ملاحظہ ہوں۔

بسنت کھیلیں عشق کی آ پیارا
تمیں ہیں چاند میں ہوں جوں ستارا
بسنت کھیلیں ہمن ہور ساجنا یوں
کہ اسماں رنگ شفق پایا ہے سارا
نبی صدقے بسنت کھیلے قطب شہ
رنگیلا ہور ہیا ترلوک سارا

گرجا ہے میگھ سرتھے تازہ ہوا ہے بستاں
پھولاں کی باس پایا بلبل ہزار دستاں
اے خوش خبر صبا توں لے جا جواں قداں کن
یمناں کی آرزو میں بیٹھے ہیں مئے پرستاں

غرض محمد قلی کی غزلیں نہ صرف ہندوستانی تہواروں، عیدوں، موسموں، مناظر فطرت، کھیلوں وغیرہ کی مکمل ترجمانی کرتی ہیں بلکہ ہندوستانی عوام کے طور طریقے، رسومات، معتقدات اور توہمات کی بھی آئینہ داری کرتی ہیں۔ اگر قطب شاہی عہد کی تہذیب کے نقوش دیکھنے ہوں تو

اس عہد کے لوگوں کے جذبات اور تصورات کا مطالعہ کرنا ہو تو اس خصوص میں محمد قلی کا کلام ہماری مکمل رہنمائی کرے گا۔

محمد قلی کی غزلوں میں حسن و عشق کے ساتھ ساتھ مذہبی رنگ بھی شدت سے ابھرتا ہے اس کی بیشتر غزلیں "نبی صدقے" سے شروع ہوتی ہیں اس میں شک نہیں کہ محمد قلی مذہب پر بھرپور عقیدہ رکھتا ہے اور وہ مذہبی ریت و رسوم پر بھی چلتا ہے لیکن مذہب کی حقیقی روح سے اس کی شخصیت اور شاعری دونوں عاری ہیں۔ اسے مذہب کے صرف تہذیبی پہلوؤں سے دلچسپی ہے ستم ظریفی یہ ہے کہ وہ اپنی عیش کوشی کو بھی نبی اور علی کا صدقہ قرار دیتا ہے ؎

نبی صدقے بارہ اماماں کرم تھے
کرو عیش جم بارہ پیاریاں سوں پیارے

محمد قلی کے کلام کا بیشتر حصہ خارجی موضوعات پر مشتمل ہے لیکن ریختیوں میں اس کا میلان زیادہ تر داخلیت کی طرف نظر آتا ہے اس کی ریختیوں میں زنانی لب و لہجہ اور عورتوں کی زبان کی مکمل خصوصیات ملتی ہیں۔ اس نے غزلوں کے مقابلے میں ریختی کے اشعار زیادہ جی لگا کر لکھے ہیں، اس لیے ان میں نکھار اور تاثر کی فراوانی ہے موزوں الفاظ، دلکش تراکیب حسین استعارات اور خوب صورت تشبیہات کے ذریعے اس نے اپنے شاعرانہ کمال اور فنی بصیرت کا مظاہرہ کیا ہے۔

جن پیو تھے بچھڑے اسے سنسار میں نیں کوچ حظ
جس ٹھار میں وہ پیو نیں اس ٹھار میں نیں کوچ حظ

پیا بچھڑا ہے مجہ کوں دکھ گھنیرا
نہ جانوں کب ملے گا پیو میرا

کوپ سوں آئے ہیں شہ مرے گھر
چندن من جھمکتا او مکھ سمن

محمد قلی نے اپنی محبوباؤں کی سراپا نگاری میں بے پناہ فنکارانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے سراپا کے بیان میں اس نے جو مسلسل غزلیں کہی ہیں ان کی ایک نمایاں خصوصیات یہ ہے کہ ان میں ہر محبوب کی بعض انفرادی خصوصیات سامنے آتی ہیں۔ اس کی بیسیوں محبوباؤں کے قد و خال اور طور طریقے ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہیں کہ ان غزلوں کی مدد سے ایک مصور ہر ایک کی علیحدہ علیحدہ تصویر بنا سکتا ہے مثلاً ننھی ایک کم سن اور نوخیز لڑکی ہے جو رسم عاشقی سے آشنا ہے اس نے مدن پھول کے رنگ کی ساڑھی باندھ رکھی ہے جب وہ چاندنی میں ناز سے چلتی ہے تو چاند لاج سے چھپ جاتا ہے اور ستارے اس کی آرتی آتارنے کے لیے دھرتی پر اتر آتے ہیں۔ اس کے چاند سے چہرے پر کجراری آنکھیں بہت زیب دیتی ہیں۔

محمد قلی طبعاً نغمہ و نشاط اور راگ رنگ کا شاعر ہے اس کی غزلوں میں آسودگی، سیرابی، سرمستی، رنگینی اور رعنائی کے تمام روپ نظر آتے ہیں لیکن اس کی شاعری محض عیش کوشی اور کامیاب عاشق کے نشاط وصل کی داستان ہی نہیں بلکہ اس میں ایک دردمند اور ہجر آشنا شاعر کے دل کی دھڑکنیں بھی سنائی دیتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس کے کلام میں فراقیہ اشعار کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے لیکن یہ اشعار محمد قلی کے فکر و فن کی گہرائی کا پتہ دیتے ہیں چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔

مو نظر سامنے نہیں ہے یار	نین پانی میں تیرتا دل دار
خدایا پیو کی جاں کوں دکھا ایک بار	دکھاں ساعرن کر غم کروں تو زار
رات میرے نین رچ سونے نہ دیویں	او ہمن گھر میں پنٹ ویرانہ کیا
تج بن پیارے نیند نکہ نیناں میں رنج آتی نہیں	رینی اندھاری ہے کٹھن تج بن کٹی جاتی نہیں

ملک الشعرا اسد اللہ وجہی۔ محمد قلی قطب شاہ کے عہد کا ایک عظیم المرتبت شاعر و ادیب ہے اس نے غالباً ابراہیم قطب شاہ کے آخری زمانے میں ایک شیوہ بیان شاعر کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔ محمد قلی قطب شاہ نے اسے اپنے دربار کا ملک الشعرا مقرر کیا تھا۔ پھر اس نے محمد قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ کا عہد بھی دیکھا۔ "قطب مشتری" "سب رس" اور "قاسمی" دیوان کے علاوہ اس کی چند غزلیں دستیاب ہوتی ہیں۔ وجہی کی آٹھ غزلیں "قطب مشتری" میں

اور دو "سب رس" میں شامل ہیں ۔ ان غزلوں کے علاوہ مولوی سخاوت مرزا اور مولوی اکبرالدین صدیقی نے اس کی مزید پانچ غزلوں کی نشاندہی کی ہے۔ وجہی کی غزلوں کے مطالعہ سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ وہ قدیم اُردو کا ایک پختہ مشق اور قادرالکلام غزل گو بھی تھا اور اس نے غالباً فارسی کے ساتھ اُردو میں بھی کوئی دیوان اپنی یادگار چھوڑا ہو گا جو ہنوز پردۂ تاریکی میں ہے۔

وجہی کی غزل کی نمایاں خصوصیات زبان و بیان کی سلاست و صفائی، واقعہ نگاری یا حقیقت پسندی ہیں۔ قدیم اُردو کے دوسرے کلاسیکی شعرا کی طرح وجہی کا کلام بھی ایک صحت مند نقطۂ نظر کی غمازی کرتا ہے۔ وجہی کی غزلیں محمد قلی کے مقابلے میں زیادہ رواں، سلیس اور پُر اثر معلوم ہوتی ہے۔

ہے دل میں تیرا عشق لئی کیوں کر سرے گا دیکھنا

کو لگ مجھے عالم منے رسوا کرے گا دیکھنا

تارے رکتے نینیاں کوں تج تاریاں میں ستی تو نہیں

شب بولتے تج زلف کوں شب میانے آئی تارکاں

وجہی کی غزلیں اصلیت اور واقعیت کی غمازی کرتی ہیں۔ اس کے کلام میں مقامی ماحول کی تہذیبی روایات اور معاشرتی خصوصیات کی چھاپ نظر آتی ہے۔ اس لیے اس کی غزلوں میں مقامی ماحول، مقامی دریاؤں، پرندوں، پھولوں، جانوروں وغیرہ کا ذکر جا بجا ملتا ہے۔ اس کے ہاں کاسی، جوگی، جوتشی، برہمن، کنول، گنگا، ہرناں، سینارے، راویاں، پنکھی، ناگ وغیرہ الفاظ مقامی اثر کی نشاندہی کرتے ہیں۔

وجہی کی غزلوں کا بیشتر حصہ عالم فراق کی کیفیات کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس کے کلام میں ایک دردمند اور حساس دل کے دھڑکنے کی آواز صاف سنائی دیتی ہے اور سوز و گداز اور تاثر کی فراوانی کا احساس ہوتا ہے۔

دیلے مرے نادیدے تو دیدار دیکھے تھے ‏ ‏ ‏ تج صبر دیو نہار وہ دیدار کہاں ہے

لوگاں پو کیا کہتے ہیں سو معلوم نیں مجے ‏ ‏ ‏ تج بے خبر کوں کاں ہے خبر تج فراق تھے

چاہتا ہے جیو پیارے ٹک بیگ آ کرم کر   تجہ درس دیکھنے کوں انکھیاں میں دم رکھیا ہوں

وجہی کی پندرہ غزلوں میں سے چھ ریختیاں ہیں ان میں جس عورت کے جذبات، احساسات اور کیفیات عشق کی عکاسی کی گئی ہے اس کی تمناؤں اور آرزوں کا مرکز اس کا پیو ہے جس پر وہ اپنا سب کچھ نچھاور کر دینا عین زندگی سمجھتی ہے اور صرف ایک ہی کی ہو کر رہنا چاہتی ہے وجہی کی ریختیوں میں جنسی تلذذ ہے اور نہ عریانی یا جذبات کی پراگندگی اس کے ہاں ایک ٹھہراؤ، پاکیزگی اور رکھ رکھاؤ کا احساس ہوتا ہے۔

یکتا ئیں سہیلی مرنا دل دوجے پر نہ دھرتا
اس پیو کوں اپنا کرتا اس پانی جیو کوں کھوے کر
پیوا اپنے کوں ٹک آج میں نس سپنے دیکھی سوے کر
جب پیو چلا سٹ سیج مج تب سوتے اٹھی روئے کر

وجہی اپنے عہد کا ایک عظیم المرتبت شاعر اور نثر نگار ہی نہیں بلکہ ایک بلند پایہ عالم، فلسفی اور حکیم بھی تھا۔ اس لیے اس کی غزلوں میں فلسفہ و تصوف، فقر و قناعت اور اخلاق و حکمت کے مضامین بھی ملتے ہیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

دکھاتا ہوں میں پرگٹ تجے یار دیک   توں بیجو تے آپس کوں اپنے مار دیک
خدا تج میں تیر تج جیسا ہے   تو دیدار میں اپنے دیدار دیک
معین نکو کر اسے ایک ٹھار   وہ ہر ٹھار ہے اسکوں ہر ٹھار دیک

باطن فقیر ہو کر ظاہر غنی رہا ہوں   لوگاں میں بارے جیوں تیوں گھر کا بھرم رکھیا ہوں
بھوکا ہوں کر کسی کن میں ہات نیں پسارا   اپس کوں آپ کھا کر اپنی شرم رکھیا ہوں

قدیم اردو کا ایک اور نامور اور عظیم المرتبت شاعر غواصی ہے۔ وہ ابراہیم قطب شاہ کے عہد میں پیدا ہوا، عمر میں محمد قلی اور وجہی سے چھوٹا تھا۔ غالباً اس نے محمد قلی کے عہد میں شاعری کا آغاز کیا۔ سلطان عبداللہ قطب شاہ نے اسے اپنے دربار کا ملک الشعرا مقرر کیا اور "فصاحت آثار" کے لقب سے نوازا۔ اس کو اپنی زندگی ہی میں غیر معمولی مقبولیت حاصل

ہوگئی تھی۔ اس کی "شکر افشانی" کے چرچے صرف دکن ہی میں نہیں بلکہ سارے ہندوستان میں ہونے لگے تھے اور اس کی اعلیٰ صلاحیتوں کے سبب "طوطیانِ ہند" اس کے "شکرستان" کی جانب رغبت کرتے لگے تھے۔ اس کو اپنی شہرت کا بخوبی احساس تھا۔ وہ کہتا ہے۔

طوطیاں سب ہند کے رغبت کریں یتوں آج تو سُن
شکرستاں ہو غواصی شکر افشانی کیا

ضربِ علی یں پور ہوں، میراں کبرا منظور ہوں
غوّاص ہو مشہور ہوں اس سلطنت کے بھار میں

اسی شہرت اور مقبولیت کی وجہ سے میر حسن، قائم اور میر تقی میر نے اپنے تذکروں میں غواصی کا ذکر کیا ہے جبکہ قدیم اُردو کے دوسرے بلند پایہ شاعر مثلاً محمد قلی قطب شاہ اور ملک الشعرأ وجہی ان تذکروں میں جگہ نہ پا سکے۔

غواصی کی تین مثنویوں (مینا ستونتی، سیف الملوک وبدیع الجمال اور طوطی نامہ) کے علاوہ غزلوں، قصیدوں اور رباعیوں پر مشتمل ایک دیوان بھی منظرِ عام پر آیا ہے۔ موجودہ مواد کی روشنی میں وہ ایک باکمال غزل گو، بلند پایہ مثنوی نگار اور ایک کامیاب قصیدہ نگار کی حیثیت سے سامنے آتا ہے۔ جہاں تک غزل گوئی کا تعلق ہے۔ غواصی دبستان دکن کا سب سے بڑا شاعر ہے غزل کے میدان میں قطب شاہی عہد کا کوئی شاعر اس کا مقابلہ کر سکتا ہے اور نہ عادل شاہی دور کا کوئی شاعر اس کے مرتبے کو پہنچ سکتا ہے۔ اس کی غزل میں بھرتی کے شعر یا ایسے اشعار بہت کم ہیں جن میں گہرا تاثر نہیں پایا جاتا۔

قدیم اُردو کے دیگر کلاسیکی شعرا کی طرح غواصی کے کلام کی نمایاں خصوصیت اظہارِ بیان کی سادگی اور حقیقت پسندی ہے لیکن جو چیز اس کو دکنی شعرا میں منفرد مقام بخشتی ہے اور اُردو کے صفِ اول کے شعرأ میں لا کھڑا کرتی ہے وہ تاثر کی فراوانی، سوز و گداز، نغمگی اور شعریت ہے غواصی کو زبان اور بیان پر بے پناہ قدرت حاصل ہے اس کے کلام میں پاکیزگی اور بلندی کا احساس ہوتا ہے اس کے انداز میں ایک اعتدال، ٹھہراؤ، اور توازن نظر آتا ہے

سس کی آواز رچی ہوئی اور مصفا ہے۔ اس کا لہجہ مدھم، دل نشین اور اپنے معاصرین یا متقدمین سے مختلف ہے، وہ اپنے پیشرو یا ہم عصروں کی بازگشت نہیں۔ غواصی دکنی غزل کے ایک نئے اسکول کا بانی ہے جس کی بعد کے بلند پایہ شاعروں نے خصوصاً ولی اورنگ آبادی نے پیروی کی ہے۔

غواصی ایک حسن پرست شاعر ہے اس کا رومانی جذبہ خارجی شاعری کی تصویر کشی میں زیادہ واضح طور پر ظاہر ہوتا ہے۔ مناظر قدرت کی عکاسی میں اس کو ید طولیٰ حاصل ہے۔ اس کی مثنویوں اور قصیدوں میں مناظر فطرت کی مرقع کشی کے متعدد بیش بہا نمونے موجود ہیں۔ غزل میں بھی اس نے منظر نگاری کا کمال دکھایا ہے۔ محبوب کے حسن کو اُجاگر کرنے کے لیے بھی اس نے مناظرِ قدرت سے طرح طرح سے کام لیا ہے۔ چند شعر ملاحظہ کیجیے۔

کمل مکھ ہور نین نرگس رنگیلا گال گل لالہ　　بھنور کر جیو کوں میرے ادک لیدا ٹیا تیرا
سہیلا گاوتے پاتاں کے ہاتاں سوں بجا تالہ　　چمن کے جھاڑ سب خوش ہو سگل پھولاں منے تیرا

اس میں شک نہیں کہ غواصی نے اپنے اردگرد کی اشیا کو آنکھ کھول کر دیکھا ہے مناظرِ قدرت کا غائر نظر سے مشاہدہ کیا ہے لیکن اس کے بیان کی خارجیت میں جذبے کی داخلیت بھی شامل ہے۔ کہیں کہیں یہ داخلیت خود کلامی کا روپ اختیار کر لیتی ہے قلبی واردات کا بیان اس نے جس جس انداز سے کیا ہے اور اس میں سادگی و پُرکاری نے جس طرح نئے نئے پہلو تراشے ہیں وہ بیک وقت اس کے جذبات کی گیرائی اور فنی پختگی کی دلیل ہیں۔ چھوٹی بحروں میں غواصی کے اشعار میر تقی میر کی یاد تازہ کر دیتے ہیں۔ حسب ذیل اشعار کی سپردگی، گداختگی اور سوز و گداز ملاحظہ کیجیے۔

دل میں اک بات ہے کسے نہ کہوں　　کہ چھٹے گی وہ بات یاں واں پڑ
دل کی دیوانگی نہیں جاتی　　پھر نکلتا ہوں بتا دعا یاں پڑ

—

اے سجن تج کوں یاد کر پل پل　　رووں اپس میں اپیچ ہیں ڈھل ڈھل

غواصی کی شاعری بنیادی طور پر جذبات و احساسات کی شاعری ہے جذبات کی

موثر ترجمانی اور قلبی واردات کی فن کارانہ عکاسی کی وجہ سے اس کا تمام کلام غنائیت کے کیف و سرور میں ڈوبا ہوا ہے۔ یہی سبب ہے کہ باوجود انتہائی سادگی کے کلام میں بلا کا اثر ہے۔ تاثر کے ساتھ اس کے کلام میں سوز و بشریت اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ وہ تیر درد سُر دل کو غزل کے ساز پر کچھ اس طرح چھیڑتا ہے کہ سننے والا بھی اپنے دل کے تاروں میں ارتعاش محسوس کرے۔

ہماری وہ چنچل سجانا کہاں	لگی چٹپٹی تھیر پانا کہاں
مجھے اس تھے دل توڑ کہتے ولے	اسوں توڑ دل جی لگانا کہاں

اس آفتاب باج مری انکھیاں تلیں   دستا ہے دیس آج شب تار کیا کروں

دوسرے دکنی شاعروں کی طرح غواصی نے بھی اپنے کلام میں ہندوستانی روایات کی ترجمانی کی ہے۔ اس کی شاعری میں ہندوستانی ماحول، ہندوستانی معاشرت، ہندوستانی تصورات یہاں کے سبزہ و گل، مناظر فطرت اور رہن سہن کے مقامی طور طریقوں کی دل کش تصویریں ملتی ہیں۔ اس کے ہاں یہ ہندوستانیت محض زبان تک محدود نہیں بلکہ اس کے خیال، سوچنے کے انداز اور طرز بیان میں بھی نمایاں ہے۔

اردو کے اکثر غزل گو شاعروں کی طرح اس نے ہندوستان میں رہ کر شیراز و اصفہان کے راگ نہیں الاپے۔ اس کے کلام میں عجمی لالہ زاروں وہاں کے پرندوں، دریاؤں یا قصوں کے حوالوں کی بجائے ہندوستانی پرندوں، جانوروں، یہاں کے موسموں، نظاروں وغیرہ کا ذکر جا بجا ملے گا۔ غواصی کی غزل میں ہندوستانی اقدار اور مقامی روایات کا احترام ملحوظ رکھا گیا ہے چنانچہ اس کے بیش تر اشعار میں حسن و عشق کے وہی مضامین اپنائے گئے ہیں جو ہندوستانی ذوق کے مطابق ہوں۔ حسب ذیل اشعار ملاحظہ ہوں جن میں نہ صرف مقامی روایات کی ترجمانی کی گئی ہے بلکہ ان اشعار کے خالق کے طرز فکر اور اس کے متخیلہ پر بھی ہندوستانیت کی گہری چھاپ ہے۔

رنگ بھریا منج گھر میں آج آیا بسنت　　غیب تھے تازا طرب لیا یا بسنت

دریں تیرا سو دین کا دیوا　　لٹ تری کفر کی ہے دیوالی

ملکِ دکھن میں حد تھے نادر ہو توں پنجی ہے کر　　ہے بے نہایت اے سکی ملک دکھن کوں آج فرح

حال یکساں نہیں کہ جیوں جمنا　　گہہ بہوں پور گہہ اتر جاوں

غواصی کا محبوب ایک پیکرِ حسن و شباب اور نسوانی محاسن کا مجسمہ ہے جس کی چلتی پھرتی پرچھائیاں اس کی غزل میں دکھائی دیتی ہیں۔ غواصی نے محبوب کے لیے واضح طور پر تانیث کا صیغہ استعمال کیا ہے اور برملا انداز میں اس کو نار، دھن، سکی، سندری، سجانا، موہنی وغیرہ ناموں سے یاد کیا ہے۔

غواصی کو اپنی بلندیٔ فکر اور شاعرانہ کمال کا شدید احساس تھا۔ وہ اپنے پیش رو یا ہم عصر دکنی شعرا میں کسی کو اپنا مد مقابل نہیں سمجھتا۔ واقعہ یہ ہے کہ غزل گوئی کے میدان میں غواصی نہ صرف دبستانِ دکن کا سب سے بڑا شاعر ہے بلکہ جدید غزل گو شعرا مومن، حسرت، جگر اور فراق سے بہت قریب نظر آتا ہے۔ اس کے کلام میں ایسے بیسیوں اشعار موجود ہیں جن میں اس نے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں اور زمانے کی قدر ناشناسی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ ایک بڑے فنکار کی طرح اپنے ہم عصروں سے اپنے فن کی داد چاہتا ہے۔

غواصی جوہراں جو تی تو لئی دھرتا جنوں میں آ　　کہاں وہ جوہری پارکھ جو پرکھے جوہراں میرے

جکوئی عارف کے صاحب سچے ہیں سو کہتے ہیں یوں　　کہ یاں تو کوئی نیں دستا غواصی کے قرینے کا

مملکت گولکنڈہ کا ساتواں تاجدار سلطان عبداللہ اردو اور فارسی کا ایک خوش گو شاعر تھا۔ اس کو شعر و ادب کا چسکا اور اہل علم و اربابِ ہنر کی سرپرستی ورثہ میں ملی تھی۔ عبداللہ قطب شاہ اور اس کے نانا محمد قلی قطب شاہ کی طبیعت و مزاج میں کئی امور مشترک ہیں دونوں نہ صرف یہ کہ بلند پایہ شاعر، علم ادب کے رسیا اور فنونِ لطیفہ کے مداح تھے بلکہ دونوں عورت اور شراب کے دل دادہ بھی تھے طبیعت اور مزاج کی اسی مناسبت کی وجہ سے عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں ادبی اور تمدنی نقطۂ نظر سے گولکنڈہ میں وہی ماحول پیدا ہو گیا تھا۔ جیسے کہ محمد قلی کے دور میں موجود تھا۔

عبداللہ قطب شاہ کا مکمل دیوان خود دریافت نہیں ہوا ہے۔ اس کا موجودہ دیوان ۱۱۸ صفحات پر مشتمل ہے جس میں صرف ردیف "ث" تک ۹۷ غزلیں اور ایک مرثیہ شامل ہے۔ سادگی و پرکاری اور بے ساختگی و برجستگی عبداللہ کی غزل کی اولین خصوصیت ہے اس نے اپنے سیدھے سادے مشاہدات، احساسات اور تجربات زندگی کو سیدھے سادے الفاظ اور رواں پیرایہ بیان میں پیش کیا ہے۔ اس کے کلام میں نہ محمد قلی کی سی رنگا رنگی، شوخی، شگفتگی اور رعنائی ہے اور نہ غواصی کی طرح تجربہ کی تہہ داری اور جذبات کی گہرائی۔

سراپا نگاری، وصل محبوب، شراب اور عورت کے مختلف اعضا کی تصویر کشی سلطان عبداللہ کی غزل کے خاص موضوعات ہیں اس کا تمام دیوان محبوب کے حسن و جمال، قد و قامت، رفتار و گفتار، لب و رخسار اور چشم و ابرو کی تعریف و توصیف سے بھرا پڑا ہے اس نے اپنی غزلوں میں محمد قلی کی طرح محبوب کا سراپا بیان کیا ہے۔ عبداللہ کی سراپا نگاری میں محمد قلی کی سی جزئیات نگاری، رنگا رنگی اور تنوع تو نہیں لیکن اس کے ہاں چلبلا پن، شوخی، عورت کے مختلف اعضا سے لطف اندوزی اور چھیڑ چھاڑ نظر نہیں آتی۔

موہن مدن متی نے پینی ہے پھول مالا ‌ ‌ ‌ ‌ یا چاند کے گلے میں حلقہ ہوا ہے ہالا

لٹ بیل ہے بنفشہ آنکھی ہر یک نرگس ‌ ‌ ‌ ‌ مکھ پھول سیوتی کا رخسار جیوں ہے لالا

مکہ نور کا دریا ہے بھویاں سو تل ہیں کالے ‌ ‌ ‌ ‌ انکھیاں تیریاں ہیں مچھلیاں لنکے سو تا اجالا

صدقے نبی کے بھایا عبداللہ شہ کے من کوں

تیرا یو ناز غمزہ تیرا یو چھند چالا

غزل میں ہندوستانی ماحول اور روایات کی ترجمانی دکنی شعرا کا اہم کارنامہ ہے دیگر دکنی شعرا کی طرح عبداللہ کی غزل بھی مقامی ماحول اور مقامی تہذیب و تمدن کی غمازی کرتی ہے۔ اصلیت، واقعیت اور حقیقت پسندی اس کی غزل کی نمایاں خصوصیت ہے اردو شاعری پر عام طور پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ ہندی نژاد ہونے کے باوجود ہندوستانی رنگ روپ سے کوئی علاقہ نہیں رکھتی اس کے سارے خد و خال ایرانی ہیں اس کی نہروں میں دجلہ و فرات کی روانی ہے

اس کی عشقیہ داستانیں شیریں فرہاد کے افسانے سناتی ہیں، اس کے باغوں میں قمری و بلبل نغمہ سنجی کرتے ہیں، اس کی بہار لالہ و گل کھلاتی ہے۔ غرض اس کی تمثیلات، تشبیہات، تلمیحات اور شاعری کے تمام عناصر عجمی ہیں۔ یہ خیال ۱۷۵۰ء کے بعد دہلی اور لکھنؤ میں نشوونما پانے والی شاعری کی حد تک درست معلوم ہوتا ہے لیکن دکنی شعرا اس خصوص میں کافی حقیقت پسند اور صحت مند نقطۂ نظر کی غمازی کرتے ہیں۔ عبداللہ کے کلام میں ہندوستانی فضا، ہندوستانی دیو مالا اور ہندوستانی تہذیب و تمدن کی مکمل ترجمانی کی گئی ہے۔ اس کی غزلوں میں بسنت رُت، مرگ اور نوروز بھی ہے اور رام کا بان، بن باس اور راجہ اندر کے اکھاڑے کی اپسرائیں، مینکا، اروشی اور رنبھا بھی، کوئل کی کوکو بھی ہے اور پپیہے کی پیہو پیہو بھی۔ بھنورا اور کنول بھی ہے چمپا اور چمیلی بھی۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

ہر اک تیرا پلک ہے رام کا بان — ہر اک سو کا ہے تیرا جیون کٹارا
بسنت آیا کھلایا پھول لالا — سکھی لیا اب صراحی ہور پیالا
کنول تو یو تجن کنول جوبن، کنول من — کنول ایسی نول تے آیا کھلایا
نین کار نبھا اربسی آ کے ناچیاں — تو ہا ہو ہو ہونے مندل بجاتا

عبداللہ قطب شاہ کی شاعری کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس کے کلام کا بیشتر حصہ غیر مردف غزلوں پر مشتمل ہے۔ اس کے پیشرو شعرا مثلاً محمد قلی، غواصی یا وجہی کے ہاں یہ رجحان بہت کم پایا جاتا ہے۔ عبداللہ کے دیوان کی منجملہ ۹۷ غزلوں میں سے ۵۶ غزلوں میں ردیف کا اہتمام روا نہیں رکھا گیا۔ اس میں شک نہیں کہ اس کی بیشتر غزلیں غیر مردف ہیں لیکن اس نے نہ صرف یہ کہ قافیہ کی مدد سے غزل کا جادو جگایا ہے بلکہ موسیقی کا احساس پیدا کرنے کے لیے متعدد غزلوں میں چار چار یا اس سے زاید قافیے استعمال کیے ہیں مثلاً

چندر کلا تیرا گلا ہے نرملا اچپلا — سو منج بھلا کے مبتلا کیا کلا دو ترملا
نین میں لا تو سکا جلا پیتا ایلا نکو گھلا — لب اچپلا ہلوں ہلا کہ جلبلا ہے دو یلا
مرا دلا ہے باولا الا بلا منجے بلا — جو مد پلا تجے گلا لیوں بھلا کے پچھلا

نبی کے صدقے عبدلا کدم کلا ستے کوں لا   تجے ہلا لیا ملا منکل گلا چندر کلا

محمد قلی قطب شاہ کی طرح عبداللہ کو بھی حضرت محمد صلعم کی ذات اقدس سے بے پناہ عقیدت تھی۔ محمد قلی کی طرح اس کی غزل کا ہر مقطع نبی صدقے سے شروع ہوتا ہے۔ مقطعوں سے قطع نظر اس کے دیوان میں تین نعتیں بھی موجود ہیں۔ وہ اپنے آپ کو نبی کا "داس" اور "سیو کی" کہتا ہے۔ دنیاوی ترقی، شاہانہ وقار، شاعری میں جادو بیانی، عیش کوشی اور وصلِ محبوب کو بھی نبی کا صدقہ قرار دیتا ہے۔

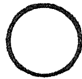
شاہ عبداللہ جو ہے حضرت نبی کا سیوکی   ہر گھڑی صلوات بھیجے دیکھ کر تیرا جمالا

صدقے نبی کے شوخ اسھڑ شاہ عبداللہ جوگی سگھڑ   تج جو بناں کے دو دی گرا خوش دست کر بیلا کا لیا

دبستانِ گولکنڈہ کے دیگر غزل گو شاعروں میں میراجی خدانما، احمد، سالک یزدی، ابن نشاطی، طبعی اور شاہ ابوالحسن کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ان شعرا نے قطب شاہی سلاطین کے عہد میں غزل کی روایت کو آگے بڑھانے میں محمد قلی، یا غواصی کی طرح کوئی اہم رول انجام نہیں دیا بلکہ دیگر اصنافِ شعر کے ساتھ دو ایک غزلیں بھی اپنی یادگار چھوڑی ہیں جن کی حیثیت تبرک سے زیادہ نہیں ہے۔

(یوم محمد قلی قطب شاہ کے ادبی اجلاس ۱۹۷۹ء میں پڑھا گیا)

(مطبوعہ سب رس۔ حیدرآباد۔ فروری ۷۹ء)



فدوی اور اس کا غیر مطبوعہ کلام

فدوی قدیم اُردو کا ایک غیر معروف لیکن باکمال صاحبِ دیوان شاعر ہے اس کے قلمی دیوان کا اب تک ایک ہی نسخہ دستیاب ہوا ہے۔ جو ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد کے خزینۂ مخطوطات کی زینت ہے[1] شعرائے اردو کے مختلف تذکروں میں فدوی تخلص کے درج ذیل شاعروں کے نام ملتے ہیں۔

۱۔ فدوی ۔ میر فضل علی دہلوی[2]

۲۔ فدوی ۔ محمد محسن ابن میر غلام علی مصطفیٰ خاں لارہوری[3]

۳۔ فدوی ۔ مرزا محمد علی دہلوی عرف مرزا بچھو[4]

---

[1] مخطوطہ ۵۸۵ ادارۂ ادبیات اُردو حیدرآباد

[2] تا [4] ۔ اسپرنگر ۔ یادگار الشعرا (ترجمہ طفیل احمد) ۱۹۴۳ء الہ آباد ۴ ۱۵۳

۴۔ فدوی ۔ مرزا فداتی بیگ لاہوری ۵؎

۵۔ فدوی ۔ سمن لال کاستھ دہلوی ۶؎

۶۔ فدوی ۔ مرزا عظیم بیگ ۷؎

۷۔ فدوی ۔ فدوی خاں دکنی ۸؎

۸۔ فدوی ۔ مکندلال ۹؎

۹۔ فدوی ۔ لالہ سیوک رام وکیل ۱۰؎

۱۰۔ فدوی ۔ شاہ محسن ۱۱؎

پیشِ نظر مخطوطے میں ایک دکنی شاعر کا کلام ہے جس نے جگہ جگہ ولی کا ذکر کیا ہے اور ولی کی غزلوں کی زمینوں میں غزلیں بھی کہی ہیں، چند اشعار ملاحظہ کیجئے ۔

سخت مشکل ہے اے عزیزاں ہو
شعر کہنا ولی کے مضمون کا

پھر پھر ولی کا مصرع آتا زباں پہ فدوی
دوزخ ہے مجھ کوں پیو بن گلزار کا تماشا

آخر الذکر شعر ولی کے اس شعر کی زمین میں ہے ۔

دیکھا ہے جن نے تیرے رخسار کا تماشا
نئیں دیکھیا سُرج کی جھلکار کا تماشا

فدوی کا مطلع اس طرح ہے ۔

اسپرنگر ۔ یادگار الشعرا ۔ ترجمہ طفیل احمد ۱۹۴۳ء الہ باد ص ۱۵۳ ۶؎ ایضاً ۷؎ ایضاً (تذکرہ سرور اور گلشن بے خار میں ان کا تخلص فداتی بتایا گیا ہے ۔ ۸؎ عبدالجبار خاں ۔ تذکرہ شعرائے دکن (جلد دوم) ص ۸۹۰ مصطفیٰ خان شیفتہ ۔ گلشن بے خار ۔ لکھنو ۔ ۱۹۸۲ ص ۱۴۷ ۱۰؎ عبدالغفور نساخ ۔ سخن شعرا لکھنو ۱۹۸۲ء ص ۳۶۰ خلیق انجم ۔ سودا ۔ (اشاریہ)

دیکھیا ہوں جب سعل تیرے رُخسار کا تماشا
لگتا ہے دشتِ آتش گلزار کا تماشا

اسی زمین میں یہ تبدیلِ قافیہ سراج اورنگ آبادی کے کلیات میں بھی ایک غزل ملتی ہے جس کا مطلع ہے :

گر آرزو ہے تجھ کوں تالاب کا تماشا
کشتی میں چشم کی آ دیکھ آب کا تماشا

مندرجہ بالا اشعار سے اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ فدوی ایک دکنی شاعر ہے اور اس کی زبان و بیان پر دکنی شاعری کی روایات اور رجحانات کی گہری چھاپ موجود ہے فدوی کے دیوان کا تعارف کرواتے ہوئے ڈاکٹر زور نے "تذکرۂ مخطوطاتِ ادارۂ ادبیات اردو" کی تیسری جلد میں لکھا ہے :

"زیرِ نظر مخطوطے میں جس فدوی کا کلام ہے وہ دکنی شاعر ہے اور ولی کا معاصر معلوم ہوتا ہے ۔ اس کے دیوان کی اکثر غزلیں ولی کی غزلوں کی ہم طرح ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ یا تو ولی کی غزلوں کے ساتھ لکھی گئی ہیں یا بعد میں ان کی زمین میں لکھی گئی ہیں" ۱

ڈاکٹر زور کے بیان اور شاعر کے کلام کی اندرونی شہادتوں سے فدوی کے دکنی الاصل ہونے میں کسی اشتباہ کی گنجائش نہیں رہتی ۔ اسلئے اغلب یہی ہے کہ پیشِ نظر دیوان فدوی خاں فدوی کی تخلیقی کاوشوں کا نتیجہ ہے جس کا ذکر عبدالجبار خاں صوفی کے "تذکرۂ شعرائے دکن" کے علاوہ لچھمی نرائن شفیق کے تذکرہ "چمنستان شعرا" میں بھی ملتا ہے

صاحب "محبوب الزمن تذکرۂ شعرائے دکن کا بیان ہے کہ :

" فدوی تخلص ، فدوی خاں نام ۔ دکنی الاصل ہے کسی تذکرہ نویس نے آپ کے اصل وطن و وفات کی نسبت کچھ نہیں لکھا ہاں میر غزلت کی بیاض سے اس قدر معلوم ہوا کہ

---

۱ ڈاکٹر زور ۔ تذکرۂ مخطوطاتِ ادارۂ ادبیاتِ اردو (ج ۳) ص ۱۲۸

۱۱۷۶ء میں حیدرآباد میں آصف جاہی منصب داروں میں معزز و مکرم تھا شاعر خوش بیان ورنگین زبان تھا۔ ظریف الطبع ولطیف الوضع تھا۔ آپ کا کلام ایہام و تلازمہ شعریہ سے پاک وصاف ہے۔ آپ کا انتقال بارہویں صدی کے شروع ہجری میں ہوا۔ من اشعار البندی۔

میں دیا جان کے تیں جان کے جاناں اپنا
جانِ من جانِ جہاں تھا مجھے معلوم نہ تھا
چپ عمر گنوایا میں ملا عشق سے دل
عشق دیلوں فیضِ رساں تھا مجھے معلوم نہ تھا
سہم مژگاں سے کیا تن کو مشبک میرے
شوخ دِل ابرو کماں تھا مجھے معلوم نہ تھا[۲]

لچھمی نرائن شفیق نے "چمنستان شعرا" میں فدوی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"بلبل خوش بیان و طوطی رنگین زبان است۔ این دو سہ ابیاتش کہ بفقیر رسیدہ اینت"

شفیق نے بھی نمونہ کلام میں وہی اشعار درج کئے ہیں جو عبدالجبار خاں صوفی نے فدوی کے تعارف کے سلسلے پیش کئے ہیں لیکن پیش نظر دیوان میں یہ اشعار نہیں ہیں اور ان اشعار کی زبان بھی فدوی کی زبان سے مختلف معلوم ہوتی ہے جس سے اس بات کا اشتباہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ اشعار کسی اور شاعر کے ہیں جنہیں سہواً فدوی کے ساتھ منسوب کردیا گیا ہے۔ اسی زمین میں سراج نے بھی ایک غزل کہی ہے۔[۳]

فدوی تخلص کے ایک شاعر کا کلام ادارۂ ادبیات اُردو کی درج ذیل بیاضوں میں بھی ملتا ہے۔

۱۔ بیاض ۸۹۶ "کلام شعرائے اورنگ آباد" اس بیاض میں فدوی کا ایک مخمس ہے

۲۔ تذکرۂ شعرائے دکن ص ص ۸۹۰ - ۸۹۱

۳۔ قدرا سرِرواں تھا مجھے معلوم نہ تھا ؛ گلشن دل میں عیاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

جس میں ایک فارسی شعر کی تضمین کی گئی ہے۔ فدوی کے علاوہ اس مخطوطے میں ولی اورنگ آبادی، سراج اورنگ آبادی، شاہ قاسم، اسد علی خاں تمنا، ضیا، اور قمر کا کلام بھی موجود ہے
فدوی کا مخمس سات بندوں پر مشتمل ہے۔ پہلا بند یہ ہے۔

سنیو ذرا یہ گفتگو شب کو پرسے آپ جو
پیتے تھے مئے سبو سبو ہل کے صنم کے دو بدو
مشغلِ مہ تھی روبرو ہم تھے یا وہ تھا تو برو
لیک ہوئے یہ سب رفو آخرِ شب نمن نہ رو
صبح دمید و شب گشت ماہ بشینہ خانہ رفت
روئے سحر سیہ شود یار بہ ایں بہانہ رفت[1]

۲۔ بیاض ۱۹۵ (ورق ۱۳ - ۱۴) اس بیاض میں بھی فدوی کا ایک مخمس ہے جو سات بندوں پر مشتمل ہے[2] یہ ایک دلچسپ نظم ہے جس کا پہلا بند درج ذیل ہے۔

اے جانِ من کہا تو کہی مں سنبھال بول
جادو نین کہا تو ہی مں سنبھال بول
سرو چمن کہا تو کہی مں سنبھال بول
گل پیرہن کہا تو کہی مں سنبھال بول
اے من ہرن کہا تو کہی موں سنبھال بول

کتب خانہ سالار جنگ کی ایک قلمی بیاض میں فدوی کے دو مخمس موجود ہیں ایک وہی ہے جس کا ایک بند ادارۂ ادبیات اُردو کی بیاض ۸۹۶ سے گذشتہ اوراق میں نقل کیا گیا ہے لیکن دونوں میں اختلافِ نسخ موجود ہے۔ کتب خانہ سالار جنگ کی بیاض میں اس مخمس میں صرف پانچ بند ہیں جب کہ ادارے کے مخطوطے میں سات بند ہیں۔

---

[1] ڈاکٹر زور۔ تذکرۂ مخطوطاتِ ادارۂ ادبیات اُردو (جلد چہارم ص ۲۶۵)
[2] ڈاکٹر زور۔ تذکرۂ مخطوطاتِ ادارہ ادبیات اُردو (ج - ۵ ص ۱۳۳) مخطوط ۱۶۸ دواوین

سالار جنگ کی بیاض کا دوسرا مخمس بھی پانچ بندوں پر مشتمل ہے۔ پہلا بند درج ذیل ہے۔

کون کہے میری طرف سے جا کے دلبر کوں سلام
ناز کے پنچوں کو اور ابرو کے خنجر کوں سلام
نین کے صمصام کو پلکاں کے نشتر کوں سلام
گلسری گلہار بازو بند پیسر کوں سلام (کذا)
کاں تلک بولوں بیاں سب تن کے زیور کوں سلام[1]

قدیم اور جدید ادب کے بلند پایہ عالم ڈاکٹر جمیل جالبی، صدر نشین مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد نے راقم کے ایک استفسار کے جواب میں "انجمن ترقی اردو کراچی" کی درج ذیل قلمی بیاضوں میں قدوی کے کلام کی نشاندہی کی ہے۔[2]

۱۔ بیاض نمبر ۳/۶۲۸ صفحہ ۱۲۴ - ۱۲۵ پر ایک مخمس درج ہے۔
۲۔ " ۳/۶۳۰ صفحہ ۳۳ پر ایک ترجیع بند درج ہے۔
۳۔ " ۳/۶۳۱ صفحہ ۱۵۰ پر ایک غزل درج ہے۔
۴۔ " ۳/۶۴۹ صفحہ ۱۱۵ تا ۱۱۸ ایک واسوخت درج ہے۔
۵۔ " ۳/۶۸۳ صفحہ ۱۰۰، ۱۱ پر ایک مرثیہ درج ہے۔

قدوی کے کلام میں شاہ علی اور عجزی کے حوالے بھی ملتے ہیں:

شاہ علی کے طفیل قدوی پر
کھل گیا کائنات کا پردا

ہوا دل چسپ قدوی کوں اے عجزی مصرعہ رنگیں
پڑی ہے کاں سوں تیغ ابروئے خمدار میں آتش

---

[1] مخطوطہ ۱۶۸ دواوین

[2] راقم الحروف کے نام مکتوب ۔ مورخہ ۱۶ رجون ۱۹۸۳ء

ہوتی ہے دل کوں فرحت کرنے سیتی مطالعہ
عجزی کے شعر میانے ہے لطف انوری کا

اول الذکر شعر سے اندازہ ہوتا ہے کہ فدوی شاہ علی کا معتقد یا مرید تھا۔ دکن میں اس نام کے دو اشخاص گذرے ہیں، ایک ادھونی کے متوطن تھے جنھوں نے ۱۲۵۰ھ میں ترجمہ شرح جعفری کے نام سے ایک تصنیف اپنی یادگار چھوڑی ہے۔ اور دوسرے شاہ علی ابن بابا شاہ حسینی ہیں جنھوں نے ۱۱۲۵ھ کے قریب "تلاوت الوجود" کے نام سے قدیم دکنی نثر میں ایک رسالہ تصنیف کیا تھا۔ یہی بزرگ فدوی کے مرشد ہو سکتے ہیں۔ شاہ علی ابن بابا شاہ کا سلسلۂ نسب چوتھی پشت میں شاہ میراں جی شمس العشاق سے ملتا ہے۔

فدوی کے کلام کے مطالعہ سے اس کی تخلیقی صلاحیتوں اور فنّی بصیرت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ اس کے کلام پر دکنی شاعری کی روایات، خصوصاً ولی اورنگ آبادی کے رنگِ سخن کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ اس بات کا بھی امکان ہے کہ بحیثیت شاعر اس نے ولی کے آگے زانوئے ادب تہہ کیا ہو۔ غالباً اسی لیے اس نے ولی کے کلام سے براہِ راست استفادہ کیا ہے۔ چند مصرعے دیکھیے:

ع کوچۂ یار عین کاشی ہے (ولی)
کوچۂ یار عین مسکن ہے (فدوی)

ع دیکھا ہے جن نے تیرے رخسار کا تماشا (ولی)
دیکھا ہوں جب سے تیرے رخسار کا تماشا (فدوی)

ع شغل بہتر ہے عشق بازی کا (ولی)
سب میں بہتر ہے کام عاشق کا (فدوی)

فدوی ایک مقطعے میں اپنی شاعری کی خصوصیات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اگر آج انوری زندہ ہوتا تو وہ میرے کمالِ فن کی داد دیتا۔ اس کی یہ شاعرانہ تعلی بے جا بھی نہیں معلوم ہوتی۔ چند شعر ملاحظہ کیجیے ؎

کس بھانت کے میٹھے بچن کہتا تو فدوی سن کے سب
اس وقت میں اچھتا اگر محظوظ ہوتا انوری

جگ میں شیرینی و لطافت سوں
شعر فدوی کا دل پذیر ہوا

اکثر سخنوران نے مجھ شعر سن کے بولے
فدوی کا ایک مصرع دیوان کے مقابل

غزل فدوی کی سن کر یوں کہے خوش ہو کے موہن نے
نہیں تجھ سار کا یا نی جگت میں تازہ مضموں کا

بولیا ہے فدوی یو غزل اس کے مقابل بولنا
ایسا سخن کہتے کسی دسرے منے پایا نہیں

فدوی کی غزلوں میں نعت اور منقبت کے اشعار بھی ملتے ہیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں :

شافعِ روزِ قیامت احمد مختار بس
ہادیِ مشکل کشا مجھ حیدرِ کرار بس

یا علی دردِ دل کا درماں کر
مشکلات جہاں کو آساں کر

یا شہِ جیلاں قدم اپنے مبارک کوں دیکھا
شاد فدوی کے کریں گے کب دلِ غم ناک کوں

فدوی کے دیوان میں دو مکمل غزلیں شیخ عبدالقادر جیلانی ؒ کی مدح میں بھی ملتی ہیں

ان غزلوں کے مطلعے اور مقطعے درج ذیل ہیں۔

دو جگ کے ملک کا ہے سلطان غوث الاعظم
ہے شاہ ہور گدا کا ایمان غوث الاعظم

ہے جان و دل سوں فدوی تیرا غلام صادق
کر اس آ ار کا مشکل آسان غوث الاعظم

کرم کی مجھ پہ فرما یک نظر یا شاہ جیلانی
کہ یعنی شام غم کوں کر سحر یا شاہ جیلانی
یہی منگتا ہے فدوی تجھ جناب عالی ہمم سیتے
ہمیشہ بخش دشمن پر ظفر یا شاہ جیلانی

فدوی اٹھارویں صدی عیسوی کے ربع اوّل کا ایک قادرالکلام اور بلند مرتبہ شاعر ہے وہ ولی کا معاصر نہیں تو سراج اور داؤد کا ہم عصر ضرور ہوگا۔ سادگیِ بیان اور تاثر کی فراوانی فدوی کے کلام کا نمایاں وصف ہے۔ چھوٹی بحریں اس کی غزلیں ایک طرف غواصی اور ولی کی ہم پلّہ معلوم ہوتی ہیں تو دوسری طرف ان کے مطالعہ سے میر تقی میر کی غزلوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ چند شعر دیکھیے:

مکھ اُپر کیس یوں دسیں دھن کے
دن پہ غالب ہے رات کا پردا

دل میرا دل ربا کے کوچے میں
کیا کروں بے قرار جاتا ہے

خبر پیو کے جانے کی سُن فدوی
جیو نکل تن سوں بھار جاتا ہے

شیشۂ چک میں گُل بدن کے سبب
ہے لبالب گلاب انکھیاں میں

چشم تر رہنا سدا دل دار پاس
ہے قدر اس لولوے نایاب کا

ہر صبح آفتاب ہات پسار
تجھ سوں منگنے کوں دان آتا ہے

ولی اورنگ آبادی کی طرح فدوی کے کلام میں بھی زبان و بیان اور اظہار اسلوب

کے اعتبار سے دکنی اُردو اور شمالی ہند کی بول چال کی زبان کے اثرات کی دھوپ چھاؤں نظر آتی ہے ۔ جس طرح ولی کے دورِ اوّل کی شاعری میں دکن کے علاقے میں بولی جانے والی زبان کا اثر غالب ہے اور شمالی ہند کے سفر کے بعد فارسی شاعری کے اثرات بڑھنے لگتے ہیں اور اس کے کلام میں پہلی بار فارسی ترکیبیں اور اضافتیں در آتی ہیں بالکل اسی طرح فدوی کے ہاں ایک طرف سوں ۔ سیں ۔ تھے ۔ سیتے ۔ (بمعنی سے) بھوت (بہت) یو ۔ (یہ) ۔ متے منیں (میں) کوں (کو) توں (تو) تجھ (تیرا' تیری) مجھ (میرا ۔ میری) ادھر (لب) اتھا (تھا) انجھو (آنسو) ادھار (سہارا) دھن پیو (محبوب) میراچ (میرا ہی) تیراچ (تیری ہی) اپس (آپ ۔ خود) لئی (زیادہ) تدھاں (تب) جدھاں (جب) جیو (جان ۔ دل) ہور (اور) وغیرہ الفاظ کی قدیم شکلیں جو اب متروک ہو گئی ہیں' ملتی ہیں تو دوسری طرف وہ تراکیب اور اضافتیں نظر آتی ہیں جو دکنی شعرا کے ہاں بالکل نہیں ملتیں لیکن ولی کے دوسرے دور کی شاعری میں بہ کثرت نظر آتی ہیں ۔ فدوی کے کلام سے چند ترکیبیں درج کی جاتی ہیں ۔

نعتِ رسولِ خدا ۔ طاق ابروے ہوشاں' شہِ ملکِ دل وجاں ۔ شافعِ روزِ قیامت ہادیٔ مشکل کشا ۔ دردسرشت عشاق ۔ دیدۂ خوں بار ۔ تاجِ مرسلاں ۔ لولوے نایاب ۔ شاہِ نجف ۔ گنجِ قاروں ۔ رتبۂ وصال ۔ قدِ موزوں ۔ فضلِ یزدانی ۔ پنجۂ عشق ۔ زاہدِ خود نما ۔ نالۂ شب گیر ۔ غمزۂ خوں ریز ۔ قتلِ عام ۔ شیشۂ چک ۔

مخطوطے کی کیفیت : یہ قلمی دیوان ۱/۲ ۷ × ۵ کے ۱۹ اوراق پر مشتمل ہے ۔ ہر صفحے پر ۱۹ سطریں تحریر کی گئی ہیں بعض صفحات کے حاشیوں میں بھی غزلیں درج کی گئی ہیں ۔ کاغذ نہایت قدیم ملگجا اور آب زدہ ہے ۔ خط نستعلیق شکستہ زمانہ کتابت قریب ۱۲۰۰ھ ۔ مخطوطہ کا آغاز ان اشعار سے ہوتا ہے ۔

ایزد کے نام پاک سوں میں ابتدا کیا
بعد از ثنا و نعتِ رسولِ خدا کیا
ہے خاتمِ نبوت ہے تاجِ مرسلاں
اس تاؤں پر سوں جیو اپس کا فدا کیا

درجِ ذیل اشعار پر یہ دیوان اختتام کو پہونچتا ہے۔

نشانہ میں ہوا ہوں جگ میں بس ہر اک ملامت کا
بجز تجھ لطف کے نئیں مجھ سپر یا شاہ جیلانی
یہی مانگتا ہے فدوی تجھ جناب عالی ہمم سیتے
ہمیشہ بخش دشمن پر ظفر یا شاہ جیلانی

قدیم اُردو کی دیگر قلمی کتابوں کی طرح دیوانِ فدوی کے مخطوطے میں املا کی درجِ ذیل خصوصیات قابلِ ذکر ہیں:

۱۔ یائے معروف اور یائے مجہول میں کوئی امتیاز نہیں ہے۔
۲۔ ک اور گ دونوں کے لیے "ک" استعمال کیا گیا ہے۔
۳۔ ٹ۔ ڈ۔ ڑ کو ت۔ ذ۔ ز تحریر کیا گیا ہے۔
۴۔ بعض الفاظ کو غیر ضروری طور پر ملا کر لکھا گیا ہے جیسے بیگنہ (بے گناہ) دوجہانمیں (دو جہاں میں)، ایکافر (اے کافر) ایدل (اے دل) میرپیر (میرے پر) میرسوں (میرے سوں) کجہنگاہی (کجنگاہی)

فدوی کے دیوان کا تعارف کرواتے ہوئے ڈاکٹر زور "تذکرۂ مخطوطات" ادارہ ادبیات اُردو" کی تیسری جلد میں لکھتے ہیں کہ "یہ دیوان مکمل ہے اور اس میں جملہ حروف کی ردیفوں میں کلام موجود ہے۔ حالاں کہ اس میں صرف ردیف الف۔ ب۔ ت۔ ث۔ ج۔ خ۔ ذ۔ ر۔ س۔ ش۔ ص۔ ض۔ غ۔ ک۔ ل۔ م۔ ن۔ و اور ی میں غزلیں ملتی ہیں۔ باقی ردیفوں میں ایک غزل بھی نہیں ہے۔

بقول ڈاکٹر زور اس دیوان کی ایک دلچسپ خصوصیت یہ ہے کہ اس کے آغاز سے قبل شاعر نے ۱۷ اشعر کا ایک قصیدہ قلمبند کیا ہے جو دراصل اس دیوان کے منظوم دیباچے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں حمد و نعت و منقبت صحابہ و دوازدہ آئمہ معصومین و مدح محبوب سبحانی و خواجہ بندہ نواز کے بعد اولیا سے مدد مانگ کر دیوان کے آغاز کرنے کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ذیل میں مکمل قصیدہ پیش کیا جاتا ہے۔

ایزد کے نام پاک سوں میں ابتدا کیا
بعد از ثنا و نعتِ رسولِ خدا کیا

ہے خاتمِ نبوت و سرتاجِ مرسلاں
اس ناؤں پر سوں جیو اپس کا فدا کیا

صدیق ہور عمر سوں مجھے روز و شب ہے کام
جس حُب کوں دو جہاں میں اپس مُدعا کیا

عثمان کا تو مہر میرے دل میں بھوت ہے
شاہِ نجف کی خاک قدم تو تیا کیا

وو ہے علی ولی کہ جو کہتے ہیں ذوالفقار
کفّار پر وو مجلسِ محشر بپا کیا

رہنے کے تیں دو جگ میں امن ہور امان سوں
وردِ زباں میں نام لو خیر النساء کیا

اوّل کیا نیاز حسن کے جناب میں
حامی اپس کا بعد شہ کربلا کیا

ہوں جان و دل سوں خدمت عابد میں معتقد
حق جس کوں زیب و زینت ہر دو سرا کیا

جاں محو ہے محبت باقر میں رات دیس

جعفر کوں صدق سات اے دل رہنما کیا
کاظم کیا یو راہِ نوازش میں پرورش
ہور حال پر کرم مرے موسیٰ رضا کیا
آداب سب ادب کے بجا لیا تقی ستے
شاہِ دو جگ نقی میں لیّ التجا کیا
اے عسکری تمن سوں مجے بہوت آس ہے
ہدی کوں روزِ حشر کے تیّں آسرا کیا
روزِ ازل سوں ہوں میں غلاماں میں پرورش
حُبّ دل میں میرے شہ جیلاں سکا جا کیا
بندہ نواز دو جو جلالت کی کر نظر
پل میں گدا کوں شہ کیا، شہ کوں گدا کیا
ان سب ولیاں سوں منگ کے سو یکبارگی مدد
دیوان کوں شروع جو یو بے نوا کیا
الہام غیب پر جو اتھا میں تو منتظر
اتنے میں یک بیک مجے ہاتف ندا کیا
قوت یو شعر کا ہوا فدوی تجے تد ہاں
جب شہ علی نے دل سوں ترے تیّں دعا کیا

اس قصیدہ کے علاوہ دیوان میں جملہ (۷۳) غزلیں موجود ہیں۔ جملہ اشعار کی تعداد (۶۰۶) ہوتی ہے۔ ڈاکٹر زور نے اشعار کی تعداد قیاساً (۷۵۰) بتائی ہے ۔
ذیل میں ردیف وار غزلوں اور اشعار کی تعداد درج کی جاتی ہے۔

ردیف	غزلیں	اشعار	ردیف	غزلیں	اشعار	ردیف	غزلیں	اشعار
الف	۱۶	۱۴۶	ذ	۵	۳۷	غ	۱	۷
ب	۱	۷	ر	۳	۲۶	ک	۱	۵
ت	۳	۱۶	س	۱	۹	ل	۱	۹
ث	۲	۱۲	ش	۱	۱۰	م	۱	۵
ج	۱	۱۰	ص	۱	۷	ن	۱۳	۱۶
خ	۱	۷	ض	۲	۱۰	و	۱	۷
						ی	۱۹	۱۵۱

ذیل میں فدوی کے قلمی دیوان سے چند منتخب غزلیں تدوین متن کے ساتھ پیش کی جارہی ہیں[2]

کہ جس مجلس منیں[3] ممتاز میرا ماہ رو ہوے گا
انگے[4] اس مہر طلعت کے چندریے[5] آبرو ہوے گا

تمارے[6] وصف میں عاجز ہوے ہیں شاعراں جگ کے
سو یک مونا بیاں کرسیں زباں گر مو بمو ہوے گا

اسے کاں[7] صبر و کاں آرام کاں طاقت کہاں راحت
سجن کے زلف کا حلقہ جسے طوق گلو ہوے گا

۱۔ ڈاکٹر زور۔ تذکرۂ مخطوطات (ج ۳) ص ۱۸۰

۲۔ راقم الحروف نے اپنے مضمون "دیوان فدوی۔ ایک تعارف" مطبوعہ سب رس (۱۹۸۶ء) میں فدوی کی ۱۳ غزلوں کا انتخاب شائع کیا تھا۔ جنہیں اس مضمون میں شامل نہیں کیا جارہا ہے (م۔ع۔ا)

۳۔ میں ۴۔ سامنے ۵۔ چاند ۶۔ تمہارے ۷۔ کہاں

اُلٹا زندِ مشرب کا تیرے پر کیا عجب ہیگا
تمہارے نین کے دیکھے جو زاہد بے وضو ہوے گا

ارسطو ناز دیکھے گا جو میرے نازنیں کا ٹک
بسر قانون حکمت کوں[۸] یو اس کا خاک کو ہوے گا

معطر مغزِ جاں تب ہوے و ہور آرام دل فدوی
کہ جب آغوش میں تیرے [۹]دو یار مشکبو ہوے گا

یک نگہ اس ماہِ عالم تاب کا ہوش کا دشمن ہے شیخ و شاب کا
بے گنہ کوں یوں ذبح کرنے کے تیں دل پشیماں نیں[۱۰] ہوا قصاب کا
تاب و طاقت نیں رہی مجھ میں رتی نیں خبر اُس[۱] اِس دلِ بیتاب کا
حلقۂ زلف پری رو میں ہوں بند دل ہوا ہے غوطہ زن گرداب کا
جو دیکھا ہے چشم میری نیم خواب خواب میں نیں ناوں لیتا خواب کا
چشم تر رہنا سدا دلدار پاس ہے قدر اس لولوے نایاب کا
خون دل سوں رنگ مرے دامن کے تیں گر ہوس ہے دھن[۱۱] تجھے سنجاب کا
دیکھ دل تیری نگاہِ گرم کوں خاصیت پیدا کیا سیماب کا
رنگ عنابی اسے بد رنگ دسے[۱۲] جو کہ خواہاں ہے لبِ عناب کا
جانگو انکھیاں ابر طوفان ہے ہوندے[۱۴] ٹک جوش کم سیلاب کا

دیکھ اس مہ رو کے تیں فدوی سکل[۱۵]
شیراں الفت تجھے مہتاب کا

---

[۸] کو [۹] یہ [۹] وہ [۱۰] نہیں [۱۱] محبوب [۱۲] دکھائی دے [۱۳] مت جا [۱۴] ہونے دے [۱۵] تمام

کر نظر پیچ و تاب کا کل کا ہے پریشاں درخت سنبل کا
سور[16] یا وصف اِس جلالت کے منفعل ہے ترے تجمل کا
جاں بلب آرہا ہے شوق ستے[17] اے صنم وقت نیں تغافل کا
گل رخسار کے تصور سوں[18] شوق دِل میں ہریا ہے بلبل کا
نیں ہے تنہا میرا چ[19] کچھ مرجع ہے توں مقصود ہر جزو و کل کا
وصف میں تجہ اے تاجِ مہ رویاں لنگ ہے رخش مجہ تامل کا
گل عذاراں کی جا عذار نجھار[20] ہے تو مشتاق یار اگر گل کا
ہوے گی یک کتاب اے زاہد گر لکھوں میں خواص کچھ مل کا
مردہ صد سال کا کفن سوں اُٹھے دم عیسیٰ ہے صوت قلقل کا
طائرِ دل ہوا ہے آہ اسیر عشق کے شاہکار جنگل کا
ختم کھانا اے دل بجائے طعام شوق ہووے اگر تناول کا
اس کوں شاہ و گدا مساوی ہے جو طریقہ لیا توکل کا

دل و جاں سوں غلام ہے فدوی
صاحب ذوالفقار و دلدل کا

خود نمائی ہے ذات کا پردا خامشی ہے صفات کا پردا
مکھ اپر کیس[21] یوں دسیں[22] وھن کے دن پہ غالب ہے رات کا پردا
چاند کی روشنی کوں ابر حجاب ہے رقیب الفصاب کا پردا
مجہ کوں دیکھے تو دور سوں موہن[23] مکہ پہ کرتے ہیں ہات[24] کا پردا

شاہ علی کے طفیل فدوی پر
کھل گیا کائنات کا پردا

---

۱۶ سورج ۱۷ سے ۱۸ سے ۱۹ میرا ہی ۲۰ غور سے دیکھ ۲۱ زلف ۲۲ دکھائی دیں ۲۳ محبوب
۲۴ ہاتھ

جگ میں برتر ہے نام عاشق کا
سب میں بہتر ہے کام عاشق کا

فخر رکھتا ہے بادشاہاں پر
ایک ادنیٰ غلام عاشق کا

اشک خونی سوں اے پری پیکر
سرخرو ہے مدام عاشق کا

خلق کوں ہور صبا[25] ہے وردِ زبان
نام ہر صبح و شام عاشق کا

اے عزیزاں وہ آہوِ وحشی
شکر ایزد ہے رام عاشق کا

ضعف سوں گر کے اٹھ کھڑے رہنا
ہے سجود و قیام عاشق کا

خم گیسوئے یار اے فدوی
فی الحقیقت ہے دام عاشق کا

کہوں میں حال یک ذرہ اگر اس جانِ محزوں کا
تپیگا قبر کے میانے سو روحِ پاک مجنوں کا

مری انکھیاں کی شادابی سوں دریا منفعل ہیں سب
عبث تمثیل دیتے ہیں نین میرے کوں جیحوں کا

ہماری اشکباری پر ہنسے تو کیا عجب زاہد
قدر نیں گوہر کے نزدیک اصلا در مکنوں کا

جہاں لگ سرخ رو جگ میں ہوئے پیدا سو باعث کیا
یو سب ہے فیض ہور دولت ہمارے اشک گلگوں کا

روا نیں حق میں عاشق کے تغافل اسقدر غافل
جو لینا فرض ہے تجھ پر خبر داں ہاے پرخوں کا

سبب تیرے بچہ الفت کا ہوس ہے شعر کے فن میں
ہریا تجھ تیغ[26] ہے جاناں [27] چمن مجھ طبع موزوں کا

[25] ہور ہا [26] میں [27] تجھ سے ہی

غزل فدوی کی سن کریوں کہے خوش ہو کے موہن نے
نہیں تجہ سا رکا باقی جگت میں تازہ مضموں کا

—

طریقہ چھوڑمت اے دل ادب کا
نہ ہو مشغول توں لہو و لعب کا

صنم تجہ حسن کے دیوان میں دل
ہے راغب بیت ابرو منتخب کا

تیری زلفاں[۲۸] تلک جو ہت لیجایا
اسی سے رشتہ ہت آیا طناب کا

لگیا ہے دل میں جس کے عشق کا تیر
اُسے پروا کہاں نام و نسب کا

نہیں میرا[۲۹] تجہ دل یک حرف طالب
کہ ہے شاہ نجف مطلوب سب کا

نگہ کے تیغ کے زخمی کوں فدوی
ہوا ہر جا تخلص جاں بہ لب کا

—

مفتوں ہو رہیا ہوں اُس چشم عنبری کا
مینائے دل میں پُر ہے نت عکس جیں پری کا

اے کافر سیہ دل اس فعل پر اپس کے
کرتے ہیں نین تیرے دعویٰ پیمبری کا

خورشید گم نجہا تجہ جا کر چھپیا فلک پر
یاقوت رشک لب سوں ساکن ہے دھرتری کا

حاصل ہوی ہے اس تھے چندر کوں روسیاہی
کرتا تھا لاف شاید تیرے سوں ہمسری کا

کیوں دل کے تیں خلش ہور تا شاق ہوئے سراسر
کو چے میں تجہ گذر ہے ہر ان مشتری کا

کہتا ہوں پند تجہ کوں سن گوشِ جان سوں جاناں
مت ترک کر توں شیوہ الطاف گستری کا

ہوتی ہے دل کوں فرحت کرتے سیتی مطالعہ
عجزی کے شعر میانے ہے لطف انوری کا

دولت تیرے وصل کی حاصل ہوی تو بس ہے
مشتاق نئیں ہے فدوی اصلا سکندری کا

—

---

۲۸ زلف کی جمع ۲۹ میرا ہی

جس کوں ہے گل عذار سوں مطلب — اس کوں نیں ہے بہار سوں مطلب
عشق کے بے قرار کوں[1] نس دن — نیں ہے صبر و قرار سوں مطلب
مجہ کوں کیا کام ہے رقیباں سوں — نیں ہے بلبل کوں خار سوں مطلب
ملتجی مت ہو کسی[2] حسیناں کا — رکھ توں پروردگار سوں مطلب
نیں ہوں ہرگز میں اور کا پیرو — مجہ ہے ہشت و چہار سوں مطلب
ہر دو عالم میں ہے سو قدوی کوں
حیدر شہسوار سوں مطلب



عاشق کے دل سوں پوچھو دلدار کی حقیقت — بلبل اپر عیاں ہے گل زار کی حقیقت
ہر تار زلف سیتے[3] دلبر کے آشنا ہوں — ظاہر ہے برہمن پر زنار کی حقیقت
میں نقد جان اپنا اس پر نثار دیوں گا — جو کوئی آکہے گا مجہ یار کی حقیقت
میرے سخن پہ تم کوں گر اعتبار نیں ہے — موسیٰ کوں جا کے پوچھو دیدار کی حقیقت
کیا احتیاج ہوگا پیتم سوں درد دل کا — مخفی طبیب پر نیں بیمار کی حقیقت
پھوڑے کا مرض اپنا ایّوب اے عزیزاں — شک نیں اگر ستے مجہ آزار کی حقیقت



جس کوں لاگی ہے یار کی لذت — اس کوں نیں کاروبار کی لذت
تیشہ فرہاد، قیس کوں زنجیر — ہے انا الحق کوں دار کی لذت
ہجر سوں رتبۂ وصال بلند — ہے خزاں سوں بہار کی لذت
زلف میں اس پری کی اے یاراں — عین ہے لیل تار کی لذت
جو پیتیا ہوے ہجر میں ہر شب — ہے اسے انتظار کی لذت
اے سجن سیر کر جو قدوی کی
چک[4] میں ہے جوئے بار کی لذت

---

۱ رات ۲ کسی ۳ سے ۴ آنکھ

بن سرِیجن کے سیر باغ عبث — روز روشن میں جوں چراغ عبث

گر نہ ہووے بزم میں ساقی دلکش — فکر مطرب مَے و ایاغ عبث

دل ناشاد کوں تو لگتا ہے — عیش دنیا کا ہور فراغ عبث

گئی جوانی پہ تجھ کوں اے جاناں — اس قدر ناز ہوا دماغ عبث

جس طرف کام نا اچھے قدوی

جستجو اس کی ہور سراغ عبث



وہ شہسوار ناز کا چڑھ کر ترنگ آج — نکلیا[1] ہے صید دل کوں سو دھر کر امنگ آج

بیتاب کیوں نہ ہوئیں یو[2] ابرو کماں سگل[3] — گاڑے ہیں تجھ نگہ کے دلاں[4] میں خدنگ آج

حوراں اگر دیکھیں تو تجھے یک نظر سجن — تجھ شمع رخ پہ جیوں[5] کوں کریں گے پتنگ آج

آتے ہیں دور دور سوں اشنان کوں ہنود — تجھ عشق میں انکھیاں سوں بہایا ہوں گنگ[6] آج

فرقت سوں تیری اے گل گلدار دلبری — ہے جامۂ حیات مرے بر میں تنگ آج



جس کوں لگیا اے شوخ تمارا[7] ادھر[8] لذیذ — اس کوں ہوی ہے تلخ جیتے[9] لگ شکر لذیذ

پرتو پڑیا ہے قد کا تیرے اس سبب تے[10] — ہے نیشکر کا آج سراپا شجر لذیذ

شیریں لباں[11] یو جا کے زمیں میں سمائے کر — اس فیض کے کدن[12] سوں ہوا ہے ثمر لذیذ

مکہ کا طواف کر کے رکھیا خال پر ادھر[13] — ہے لیس کہ یار بوسہ اسود حجر لذیذ

کل رات مَے پیا سو اے قدوی دو گل عذار — باقی رہیا[14] انکھیاں منے[15] اس کے اثر لذیذ

---

۱ نکلا ۲ یہ ۳ تمام ۴ دل کی جمع ۵ دل، جان ۶ گنگا ۷ تمہارا ۸ لب ۹ زندگی بھر ۱۰ سے ۱۱ لب کی جمع ۱۲ منہ سے ۱۳ لب ۱۴ رہا ۱۵ میں

تیری بھواں کوں دیکھ ییں خنجر گیا بسر[1]
تجہ قد انگے[2] ییں سرو و صنوبر گیا بسر

کیا روشنی ہے مکھ پہ ترے خور صفت صنم
جس کوں تجھا[3] کے ماہ منور گیا بسر

لکھنے کے وقت درد مرا کاتب ازل
سد بد گنوا کے محو ہو دفتر گیا بسر

کئی دن ہوئے جو نامہ لکھیا تھا سجن مرا
معلوم یوں ہوا مجھے اکثر گیا بسر

طالب ترے درس[4] کا جو فدوی ہوا جدھاں
آرام و صبر و ہوش وہ یکسر گیا بسر

یا علی درد دل کا درماں کر
مشکلات جہاں کوں آساں کر

سروری دے کے جن و انس اوپر
مجہ کوں اس دور کا سلیماں کر

کیوں ہوا حال سوں مرے غافل
وقت احسان کا ہے احساں کر

دے بہر حال دل کوں جمعیت
زلف مانند مت پریشاں کر

مثل خورشید یک نظر فرما
سنگ کوں جوہر بدخشاں کر

روز اول ییں حق سوں آیا ہوں
تجہ غلامی کا عہد و پیماں کر

یو ہے فدوی کا عرض شاہ نجف
ہند کے تیں تو رشک ایراں کر

پڑی ہے برق رخ سوں خرمن گلزار ییں آتش
عجب کیا عشق تجہ ڈالے دل ہر خار ییں آتش

پگلتا ہے حرارت سوں یو مغز استخواں تن ییں
سریجن[5] کس بلا کی ہے ترے دیدار ییں آتش

جھلی مکھ کی زلفاں[6] ییں سوں[7] پیو[8] کی یوں عیاں دسی[9]
جو سلگاتے ہیں گویا لشکر کفار ییں آتش

نگاہ کرم کی تابش ہوی معلوم یوں دل کوں
سٹے کوئی لیا کے جوں یا رود کے انبار ییں آتش

جگر سوں آہ کھینچے پر دیکھو لوے کباب آوے
بھری ہے اس قدر مجہ سینۂ افکار ییں آتش

ہوا دل چپ فدوی کوں اے عجزی مصرع رنگیں
پڑی ہے کاں سوں یہ تیغ ابروے خمدار ییں آتش

---

۱ بھول ۲ سامنے ۳ غور سے دیکھنا ۴ دیدار ۵ محبوب ۶ زلف کی جمع ۷ سے ۸ محبوب ۹ دکھائی دیتی ہے۔

ہے نظارے سوں تیرے دیدۂ خوں بار کوں فیض
یار کوں کیوں نہ اچھے فیض، ہے اغیار کوں فیض
اے شفا بخشِ دلِ زرد سرشت عشاق
ہے لب لعل سوں تجہ عشق کے بیمار کوں فیض
عکس شاید کہ پڑیا تھا لب نوشیں کا تیرے
اس سبب تھا سو مسیحا کیرے گفتار کوں فیض
دیدۂ تر سوں اچھے خاطر افسردہ مفید
جوں کہ یاراں سوں ہے دائم گل و گلزار کوں فیض
اہل دل کیوں نہ ہویں محظوظ و ممنوں تجہ سوں
شعر تیرے سوں ہے قدسی در و دیوار کوں فیض



جب سوں دیکھا ہوں تجہ پری کا جھلک ۔ تب لگتا نیں مشتری کا جھلک
شوق سیتے ہو چشم سرتاپا ۔ ٹک دکھا کسوتِ زری کا جھلک
نین نرگس کے ہور ہے بے نور ۔ دیکہ تجہ چشمِ عنبری کا جھلک
تجہ نین سوں ہے جلوہ گر مو مو ۔ اے سجن سحر سامری کا جھلک
منتظر در پہ ہے کھڑا قدسی ۔ دیکھنے زلف عنبری کا جھلک



جانیا[2] ہوں دلربا کوں میں جان کے مقابل
تیں سہو سوں کہیا ہوں ایمان کے مقابل
کس واسطے عبث میں گلشن میں جاوں بولو
ہے بسکہ خط لیو تیرا ریحان کے مقابل

۱۔ لباس ۲۔ جاتا

کرنے کے تیں تلاوت کیوں ذوق[۳] مجھ نہ ہووے
سمجیا[۴] ہوں مکھ کوں تیرے قرآن کے مقابل

ہرگز رقیب سیتے[۵] اے من اچھ[۶] توں یک تل[۷]
مکر و فریب میں ہے شیطان کے مقابل

کوچے میں عشق کے یو[۸] البتہ سد گنوادے
فہمید گی میں گر ہووے سبحان کے مقابل

اس ملک کی صفت میں جیتا کہوں تو تھوڑا
پیدا کیا اُسے حق کنعان کے مقابل

اکثر سخن وراں نے مجھ شعر سن کے بولے
فدوی کا ایک مصرع دیوان کے مقابل



گر دیکھے میرے چشم گریاں کوں — بھول جاویگا نوح طوفاں کوں
مکھ تیرا دیکھ کر گلستاں میں — چاک کرتے ہیں گل گریباں کوں
زلف کا گل[۱] میں باندنا[۲] زنار — شوق ہوتا ہے ہر مسلماں کوں
غرق لاکھاں[۳] سیتے ہوئے ہیں دل — کیا عمق ہے چہ زنخداں کوں
باغ جنت میں رشک سوں تیرے — داغ دل میں اچھیگا[۴] رضواں کوں
اس کوں حاصل ہے نت[۵] پریشانی — جو دیکھا زلف تجھ پریشاں کوں

ہووے فدوی ترے پہ جب مشکل
یاد کر توں شہ خراساں کوں

---

۳ مجھے ۴ سمجھا ۵ سے ۶ رہ ۷ لمحہ ۸ یہ
۱ گلا (گلے) ۲ باندھنا ۳ لاکھ کی جمع ۴ ہوگا ۵ ہمیشہ



دیکھ کر دھن کے پر خمار انکھیاں
کیوں ہیں بیتاب و بے قرار انکھیاں

بین مرے چک میں اشک تجہ خاطر
لیاے کرنے کوں دُر نثار انکھیاں

کیا کہوں کس سوں جا کروں فریاد
آج کھویاں مرا وقار انکھیاں

خوبرویاں اپر اٹک کے عبث
مجہ کوں کیتیاں ہیں شرمسار انکھیاں

یو بچہ ہے فکر دل میں مجہ نس دن
کس وقت ہوینگیاں دوچار انکھیاں

بول فدوی کدن سوں موہن کوں
آود رکھتیاں ہیں انتظار انکھیاں



کیوں نہ آوے گا آب انکھیاں میں
جا کیا آفتاب انکھیاں میں

شیشۂ چک میں گلبدن کے سبب
ہے لبالب گلاب انکھیاں میں

تاب تجہ مکہ کا جب سوں دیکھیا ہوں
تب سیتی نیں ہے تاب انکھیاں میں

جن نے دیکھیا دو چشم میگوں کوں
ہے اسے خونِ ناب انکھیاں میں

عجز سوں میں کیا سوال تو مجہ
چپکے دیتا جواب انکھیاں میں
جو کیا دل سوں عشق کا سودا
ان نے پایا ہے لاب[1] انکھیاں میں
شاہ ہے دل کے ملک کا قدوی
جس کے تئیں ہے حجاب انکھیاں میں



اے سرو قد شیریں زباں جگ میں ترا ثانی نہیں
ہور حسن کے بن کوں سکل ترے بغیر پانی نہیں
لکھتے وقت نامہ تجے ازبسکہ درد دل سیتے
رویا رگت[2] سو ہے نشاں کاغذ یو افشانی نہیں
تجہ ہجر کے باعث سوں دھن[3] جو دل پریشاں ہے مرا
زلف پریشاں میں تیری اتنی پریشانی نہیں
سیر چمن سوں تازگی حاصل نہیں دل کوں رتی
ہے عندلیب گل رخاں بلبل گلستانی نہیں
بولیا ہے قدوی یو غزل اس کے تقابل بولنا
ایسا سخن کہتے کسی دسرے منے پانی نہیں



مت تمیں آ کے مجہ سلام کرو
چپ نہ رسوائے خاص و عام کرو

۱۔ فائدہ ۲۔ خون ۳۔ محبوب

نہ رکھو مجھ کوں نیم بسمل کر
قتل کرنا تو با اہتمام کرو

ہات میرا پکڑ کے کر ممتاز
نیک نامی کا جگ میں نام کرو

شربت لب پچکھا مریض کے تیں
ہو کے دھرمی دھرم کا کام کرو

آئے ہو تو خموش کیا بیٹھو
کچھ میٹھے ہم سیتی کلام کرو

نظر لطف حالِ فدوی پر
گاہ گاہ کیا علی الدوام کرو



جب دار سوں کیا ہے منصور آشنائی
تب جا ہوا ہے جگ میں منظور آشنائی

صحت اسے نہیں ہوئی لقمان کی دوا سوں
جو دل ہوا ہے یاراں رنجور آشنائی

دکھلا کے آس اول بعد از نراس[1] ناکر
کرنا دغا نہیں ہے دستور آشنائی

ظلمت جو یک کدھن[2] سوں معدوم ہوئی سراسر
روشن ہوا جہاں میں جب سور[3] آشنائی

ہر چند زہد و تقوی کیتا تو کیا ہے حاصل
منزل کوں نا انپڑ[4] سکے بے نور آشنائی

---

۱ مایوس ۔ ۲ طرف ۳ سورج ۴ پہنچ سکے

ہر آن ہر گھڑی میں منگتا ہوں پوچھ[۱] حق سوں
کس کوں نہ کر توں جگ میں چھوڑ آشنائی
یک پل میں ایک لحظہ آرام ہور راحت
بالکل ہوا ہے فدوی دل چھوڑ آشنائی



بن جدا ہو کے یار جاتا ہے
عیش کا سو بہار جاتا ہے
تس کوں کس کوں دکھا نہ اپسیں[۲] صنم
چاند کا اعتبار جاتا ہے
کھول ٹک دیکھ چشم عبرت سوں
صنعت کردگار جاتا ہے
جس کے دیکھے سوں ایک پل میں[۳] تے
ہات[۴] سوں ٹل اعتبار جاتا ہے
دل مرا دلربا کے کوچے میں
کیا کروں بے قرار جاتا ہے
ین چلیا ہے سفر کوں وو مہ رو
بیکاں کا ادھار[۵] جاتا ہے
آج تجھ ایک تن کے جانے سوں
ملک کا سب سنگار جاتا ہے
اب تغافل کیتیں نہ دیکھ جاتن
وقت بوس و کنار جاتا ہے

۱۔ بھی ۲۔ اپنے آپ کو ۳۔ میں ۴۔ ہاتھ ۵۔ سہارا

ہو رہیا حیف ہیں یو شہر غریب
شہر کا شہر یار جاتا ہے
پیو[1] کے جاتے کی سن خبر فدوی
جیو[2] نکل تن سوں پھار جاتا ہے



جس کوں قربت ہیں تجھ[3] ارادت ہے
دو جہاں ہیں اسے سعادت ہے
شوق سوں تجھ گلی ہیں چل جاتا
بہتر از طاعت و عبادت ہے
تیغ ابرو سوں دھن کے عاشق کوں
دم بدم لذت شہادت ہے
کفر ہے شبہہ تجھ جناب منے
کہ یو انوار سب سیادت ہے
آمرے گھر کوں کر ثواب حاصل
یوں سمجھ دل ہیں یو عیادت ہے
دل ہیں مرے پڑیا[4] ہے ہول و ہراس
لطف تیرا خلاف عادت ہے
صحبت یار کوں غنیمت جان
ہر زماں فیض ہے افادت ہے



---

۱ محبوب ۲ جان ۳ تیری ۴ پڑا

دل میں مجھ یوں گماں آتا ہے
آج وو مہرباں آتا ہے

شکر اللہ کہ وو مسیحا دم
پھر کے دینے کوں جان آتا ہے

ہدف دل پہ تیر عشق لگے
جب وو ابرو کماں آتا ہے

بے سبب مجھ غریب پر دیکھو
چیکے ابرو کوں تان آتا ہے

فرش رہ کر اسے دل توں دیڈیاں کوں
صاحب عز و شان آتا ہے

فخر برجا کروں فلک پہ جو شہ
میرے گھر میہمان آتا ہے

غم میں اپنے کیا جو پیر مجھے
پھر کے وو نوجواں آتا ہے

لال ہوتی زباں فصیحاں کی
جب وو روشن بیان آتا ہے

ہر صبح آفتاب ہاتھ پسار
تجھ سوں منگنے کوں دان آتا ہے



(مطبوعہ سب رس۔ حیدر آباد جولائی ۷۸ء)

۱/ دیدہ کی جمع ۲/ ہاتھ ۳/ سے ۴/ خیرات

ڈاکٹر جمیل جالبی اور دکنی ادب کی تحقیق

ڈاکٹر جمیل جالبی برصغیر ہندو پاک کے علمی و ادبی حلقوں میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ اردو دنیا میں وہ، بیک وقت ایک بلند پایہ عالم، قد آور محقق، صاحبِ نظر نقاد، کامیاب مترجم اور اردو تحریک کے ایک فعّال نمائندے کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں۔ مختلف موضوعات پر ان کی اب تک بتیس کتابیں اور تین سو سے زائد مضامین شائع ہوئے ہیں۔ دس کتابوں کے ہندوستانی ایڈیشن شائع ہوئے ہیں اور بعض کتابوں کے دو اور تین تین سے زاید ایڈیشن منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی بنیادی طور پر محقق اور نقاد ہیں لیکن انھوں نے ترجمہ، تاریخ ادب، افسانہ، داستان اور کلچر جیسے موضوعات پر بھی خامہ فرسائی کی ہے۔ ڈاکٹر جالبی کے نام کے ساتھ ہی ذہن میں ایک قد آور ادبی شخصیت اور اس کے متنوع تحقیقی تنقیدی ثقافتی، علمی اور ادبی کارناموں کا تصور اجاگر ہوتا ہے۔ جالبی صاحب نے اردو زبان و ادب کے لیے جو تن تنہا کام کیا ہے، وہ کئی اداروں کا

جانب سے کیے جانے والے کام پر بھاری ہے۔ ایک طرف تو ان کا چار ضخیم جلدوں پر مشتمل مبسوط، سیر حاصل اور معرکہ آرا کارنامہ "تاریخِ ادبِ اردو" ہے۔ تو دوسری جانب مغربی تنقید کے افکار کے تراجم پر مبنی ان کی فقید المثال کتابیں "ایلیٹ کے مضامین" اور "ارسطو سے ایلیٹ تک" ہیں جو کسی بھی طرح "تاریخ ادب اردو" سے کم تر اہمیت کی حامل نہیں اس کے علاوہ تحقیق و تنقید، دکنیات، تدوینِ متن اور ثقافتی مسائل جیسے مختلف النوّع موضوعات پر ان کے کارناموں کو ہمیشہ قدر کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا۔

ڈاکٹر جالبی کی اولوالعزمی اور نئے علمی گوشوں کی تلاش نے حال ہی میں انہیں فنی اور علمی اصطلاحات اور لغت نویسی کے میدان کی طرف متوجہ کیا ہے اس سلسلہ میں ان کی مرتبہ "فرہنگِ اصطلاحاتِ جامعہ عثمانیہ (۱۹۹۱ء)" اور "قومی انگریزی اُردو لغت (۱۹۹۲ء)" کے نام قابلِ ذکر ہیں، اوّل الذکر کتاب میں بتیس علوم و فنون اور ان کی ذیلی شاخوں سے متعلق انگریزی اصطلاحات اور ان کی اردو مترادفات حروفِ تہجی کے اعتبار سے ترتیب دیئے گئے ہیں۔ آخر الذکر کتاب انگریزی اُردو لغت ہے۔ جس میں کم و بیش دو لاکھ الفاظ، اصطلاحات و معانی کو یکجا کیا گیا ہے۔

تاریخی اعتبار سے ڈاکٹر جمیل جالبی کی تصانیف، تالیفات اور تراجم حسبِ ذیل ہیں۔

۱۔ جانورستان (جارج آرول کے ناول "اینمل فارم" کا ترجمہ)۔ کراچی۔ ۱۹۵۸ء

۲۔ ایلیٹ کے مضامین (ایلیٹ کے نو مضامین کا ترجمہ) کراچی۔ ۱۹۶۰ء۔ اس کتاب کا ہندوستانی ایڈیشن بھی لکھنو سے شائع ہوا تھا۔ (تاریخ ندارد)
ایلیٹ کے مضامین کا دوسرا ایڈیشن "جس میں چودہ مضامین کا ترجمہ شامل ہے کراچی سے ۱۹۷۷ء میں منظرِ عام پر آیا اور ہندوستانی ایڈیشن ۱۹۷۸ء میں دہلی سے چھپا۔

۳۔ حاجی بغلول (منشی سجاد حسین کا مزاحیہ ناول) کراچی۔ ۱۹۶۱ء

۴۔ پاکستانی کلچر: قومی کلچر کی تشکیل کا مسئلہ کراچی ۱۹۶۴ء۔ دوسرا تیسرا چوتھا پانچواں اور چھٹا ایڈیشن بالترتیب

۱۹۶۶ء۔ ۱۹۷۳ء۔ ۱۹۸۴ء ۱۹۸۴ء۔ ۱۹۸۵ء۔ میں کراچی اور اسلام آباد سے شائع ہوا۔

۵۔ تنقید اور تجربہ (تنقیدی مضامین کا مجموعہ) کراچی ۱۹۶۷ء

۶۔ دیوانِ حسن شوقی (تحقیق و تدوین)۔ کراچی۔ ۱۹۷۱ء

۷۔ دیوان نصرتی۔ (تحقیق و تدوین)۔ لاہور۔ ۱۹۷۲ء

۸۔ مثنوی نظامی دکنی المعروف بہ کدم راؤ پدم راؤ (تحقیق و تدوین) کراچی۔ ۱۹۷۳ء
ہندوستانی ایڈیشن۔ دہلی۔

۹۔ قدیم اُردو کی لغت۔ لاہور ۱۹۷۳ء

۱۰۔ تاریخ ادب اُردو (جلد اول) لاہور ۱۹۷۵ء۔ ہندوستانی ایڈیشن۔ دہلی۔ ۱۹۶۸ء
دوسرا ایڈیشن۔ لاہور۔ ۱۹۸۶ء

۱۱۔ ارسطو سے ایلیٹ تک (ترجمہ) کراچی۔ ۱۹۷۵ء۔ دوسرا ایڈیشن اسلام آباد ۱۹۷۶ء
تیسرا ایڈیشن۔ اسلام آباد۔ ۱۹۸۵ء۔ ہندوستانی ایڈیشن۔ دہلی تاریخ ندارد

۱۲۔ محمد تقی میر (حیات، سیرت، تصانیف اور مطالعہ شاعری)۔ کراچی۔ ۱۹۸۱ء
ہندوستانی ایڈیشن دہلی۔ ۱۹۸۳ء

۱۳۔ تاریخ ادب اُردو جلد دوم حصہ اول۔ لاہور ۱۹۸۲ء۔ ہندوستانی ایڈیشن
دہلی۔ ۱۹۸۵ء۔ دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۷ء۔ (لاہور)

۱۴۔ تاریخ ادب اُردو جلد دوم حصہ دوم۔ لاہور۔ ۱۹۸۲ء۔ ہندوستانی ایڈیشن ۱۹۸۵ء
دوسرا ایڈیشن لاہور۔ ۱۹۸۷ء

۱۵۔ حیرت ناک کہانیاں (بچوں کے لئے) کراچی ۱۹۸۳ء

۱۶۔ پاکستان۔ دی آئی ڈنٹٹی آف کلچر (مترجم ہادی حسین) کراچی۔ ۱۹۸۴ء

۱۷۔ نئی تنقید (مجموعہ مضامین) کراچی ۱۹۸۵ء

۱۸۔ بزم خوش نفساں۔ (شاہد احمد دہلوی کے چھبیس سوانحی خاکے) کراچی۔ ۱۹۸۵ء

۱۹ - حیرت ناک کہانیوں (سندھی)، ۱۹۸۵ء

۲۰ - ادب، کلچر اور مسائل (مضامین کا مجموعہ)، کراچی۔ ۱۹۸۶ء

۲۱ - ن۔م۔راشد۔ ایک مطالعہ ۱۹۸۶ء کراچی۔

۲۲ - دی بیسینگ ورلڈ آف اسلام (انگریزی) باشتراک ڈاکٹر قاضی عبدالقادر کراچی۔ ۱۹۸۶ء

۲۳- پاکستانی کلچر (سندھی میں) مترجم ڈاکٹر ایاز قادری کراچی ۱۹۸۸ء

۲۴- کلیات میراجی - ۱۹۸۹ء

۲۵- اسلامی جدیدیت ۱۹۸۹ء

۲۶- قومی زبان : یک جہتی : نفاذ اور مسائل ۱۹۸۹ء

۲۷- میراجی - ایک مطالعہ ۱۹۹۰ء

۲۸- اسلامی کلچر ۱۹۹۰ء

۲۹- معاصر ادب ۱۹۹۰ء ۳۰۔ فرہنگ اصطلاحات جامعہ عثمانیہ اسلام آباد۔ ۱۹۹۱ء

۳۱- تحرجی (بچوں کے لیے) ۱۹۹۰ء ۳۲۔ قومی انگریزی اُردو لغت ۹۲ء

دکنی ادب کی تحقیق اور تدوین متن کے سلسلہ میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ دکنیات سے متعلق ان کی تصانیف کا جائزہ لینے سے قبل ضروری معلوم ہوتا ہے کہ دکنی ادب کی بازیافت اور قدیم متون کی ترتیب و تدوین کے پس منظر پر بھی سرسری نگاہ ڈالی جائے۔

دکنی ادب کی تلاش و تحقیق کے پہلے مرحلے کا آغاز بیسویں صدی کے ربع اول سے ہوتا ہے۔ حکیم شمس اللہ قادری، مولوی عبدالحق، محی الدین قادری زور، عبدالقادر سروری، نصیر الدین ہاشمی، سید محمد، میر سعادت علی رضوی اور عبدالمجید صدیقی نے دکنی اُردو کے متعدد ادب پاروں کی ترتیب و تدوین کی۔ قدیم ادبیات کی بازیافت کی ان اولین کاوشوں کے نتیجے میں دکنی ادب کی جو کتابیں منظرِ عام پر آئیں، ان میں تحقیق سے زیادہ تدوین کی جانب توجہ کی گئی۔ یہ کوشش بنیادی طور پر ماخذ کے تحفظ پر مرکوز تھیں

اور اگر تحقیق و تدوین متن کے جدید اصولوں کی روشنی میں ان کا جائزہ لیا جائے تو دو چار مستثنیات سے قطع نظر یہ کام غیر تشفی بخش اور خامیوں سے پُر نظر آئے گا۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان کتابوں کے منظرِ عام پر آنے سے آئندہ نسلوں کے لیے تلاش و تحقیق کی راہیں کافی آسان ہوگئیں۔

قدیم دکنی ادب پر تحقیقی کام کے دوسرے مرحلے کی ابتدا ۱۹۶۵ء میں شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ سے شائع ہونے والے مجلے "قدیم اردو" سے ہوتی ہے۔ اس مجلے میں، قدیم دکنی ادبیات کے منتخب متون کو، تنقیدِ متن کے جدید اصولوں کی روشنی میں، مختلف نسخوں کے تقابلی مطالعہ کے بعد، صحت کے ساتھ مرتب کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی۔ "قدیم اردو" کے ابتدائی چند شمارے آج بھی تحقیق و تنقید اور تدوینِ متن کے مستند نمونوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس مجلے کے ذریعے منظرِ عام پر آنے والے نامور محققین میں مسعود حسین خاں، غلام عمر خاں، اکبر الدین صدیقی، سیدہ جعفر، حسینی شاہد، ابوالنصر محمد خالدی اور مبارز الدین رفعت وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

دکنی اردو کے بیشتر محققین یا تو سرزمینِ دکن ہی کی خاک سے اُٹھے ہیں یا پھر جامعہ عثمانیہ کے تربیت یافتہ ہیں۔ قدیم اردو کے وہ عالم اور محقق جنہوں نے دیارِ دکن سے دور رہ کر، دکنی ادبیات کی تحقیق و ترتیب کے سلسلہ میں بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ ان میں ڈاکٹر جمیل جالبی کا نام سرفہرست ہے

دکنیات کے سلسلہ میں ڈاکٹر جالبی کی درج ذیل کتابیں قابل ذکر ہیں۔

۱۔ دیوان حسن شوقی ۲۔ دیوان نصرتی ۳۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ۔

۴۔ قدیم اردو کی لغت ۵۔ تاریخِ ادب اردو (جلد اول)

دیوان حسن شوقی:۔ دکنی ادب کی تحقیق و تدوین کے سلسلہ میں ڈاکٹر جمیل جالبی کی پہلی کتاب "دیوانِ حسن شوقی" ہے۔ ۱۹۴ صفحات پر مشتمل یہ کتاب انجمن ترقی اردو کراچی پاکستان

کی جانب سے ۱۹۷۱ء میں منظر عام پر آئی۔

حسن شوقی قدیم دکنی کا ایک باکمال اور عظیم المرتبت شاعر تھا۔ ابن نشاطی سے ولی تک کم و بیش تمام بلند پایہ شاعروں نے، اس کی استادی اور کمالِ فن کا اعتراف کیا ہے مولوی عبدالحق نے سب سے پہلے، دو مثنویوں اور تین غزلوں کے حوالے سے، حسن شوقی کو اردو دنیا سے متعارف کر دیا تھا۔[1] بعد کو مولوی سخاوت مرزا اور ڈاکٹر حسینی شاہد نے اس کی مزید آٹھ غزلیں دریافت کیں۔[2]

ڈاکٹر جمیل جالبی کے مرتبہ دیوان میں شوقی کی دونوں مثنویوں "فتح نامہ نظام شاہ" اور "میزبانی نامہ" کے علاوہ تیس غزلیں اور ایک نظم شامل ہے۔[3] یہ کتاب اگرچہ دکنی ادب کی تحقیق سے متعلق جالبی صاحب کی پہلی تصنیف ہے لیکن اس کے مطالعہ سے وہ ایک صاحبِ نظر محقق اور ماہر دکنیات کے روپ میں سامنے آتے ہیں۔ انھوں نے تحقیق و تدوین اور تنقیدِ متن کے جدید اصولوں کی روشنی میں، قدیم اردو کے ایک باکمال شاعر کے کلام کو عالمانہ مقدمے کے ساتھ مرتب کیا ہے۔

دیوان حسن شوقی کا مقدمہ ۶۸ صفحات پر پھیلا ہوا ہے، جس میں ممکن الحصول ذرائع سے شاعر کے حالاتِ زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور بحیثیت مثنوی نگار اور غزل گو شوقی کے مرتبے کا تعین کیا گیا ہے۔ بیاضوں کا تعارف، املا کی خصوصیات اور لسانی مطالعہ جیسے مباحث کی شمولیت سے مرتب کے مطالعہ کی وسعت اور دقتِ نظر کا پتا چلتا ہے۔

---

[1] رسالہ اردو۔ جولائی ۱۹۲۹ء

[2] رسالہ اردو۔ کراچی۔ اپریل ۱۹۵۴ء میں مولوی سخاوت مرزا نے تین غزلیں اور ڈاکٹر حسینی شاہد نے "قدیم اردو" ۱۹۶۵ء میں پانچ غزلیں شائع کی تھیں۔

[3] راقم الحروف نے حال ہی میں حسن شوقی کی ایک اور غزل دریافت کی ہے۔ اس طرح اس کی غزلوں کی تعداد جملہ ۳۱ ہوتی ہے۔ دیکھیے دکنی شاعری۔ تحقیق و تنقید ۱۹۸۸ء۔ حیدرآباد۔ ص ۸۴

حسن شوقی کے واقعاتِ حیات اور ادبی کارناموں کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں کہ جنگ تالی کوٹ کے وقت (۱۵۶۴-۶۵ء) شوقی نظام شاہی دربار سے وابستہ تھا۔ اسی لیے اس نے فتح کا سہرا حسین نظام شاہ کے سر باندھا ہے، حالانکہ اس جنگ میں چاروں بادشاہ (ابراہیم قطب شاہ، علی عادل شاہ اول، علی برید شاہ اور حسین نظام شاہ) برابر کے شریک تھے۔ "فتح نامہ نظام شاہ" کے دستیاب دونوں قلمی نسخوں کے تقابلی مطالعہ کے بعد ڈاکٹر جالبی نے مولوی عبدالحق کے خیال سے اختلاف کرتے ہوئے "نسخہ ثانی" کو نہایت اہم اور بنیادی نسخہ قرار دیا ہے۔ انہوں نے اپنے دعوے کی بنیاد ایسے دلائل پر رکھی ہے کہ شک و شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے بڑی ژرف نگاہی، عرق ریزی اور چھان بین کے بعد "فتح نامہ" کے دونوں نسخوں میں بکھرے ہوئے اشعار کو یکجا کر کے اس مثنوی کو ایک نئی اور ترقی یافتہ شکل میں پیش کرنے کی کامیاب سعی کی ہے۔

مثنوی "میزبانی نامہ" میں سلطان محمد کی ایک شادی سے بحث کرتے ہوئے جالبی صاحب نے مولوی عبدالحق، ڈاکٹر زور، نصیر الدین ہاشمی اور حسینی شاہد سے اختلاف رائے کرتے ہوئے پہلی بار یہ انکشاف کیا ہے کہ متذکرہ مثنوی میں "سلطان محمد کی جس شادی کو موضوعِ سخن بنایا گیا ہے وہ مصطفیٰ خاں وزیر اعظم کی دختر کے ساتھ نہیں بلکہ نواب مظفر خاں کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ اپنے بیان کی تصدیق کے طور پر انہوں نے "میزبانی نامہ" کی درج ذیل سرخی نقل کی ہے۔

"در بیان مہمانی کردن سلطان محمد عادل شاہ دادن جہیز دخت نواب مظفر خاں"

یہ اس قدر ٹھوس اور واضح استدلال ہے کہ قادری کے لیے محقق کے بیان سے اتفاق کیے بغیر کوئی چارہ کار باقی نہیں رہ جاتا۔

جہاں تک غزل گوئی کا تعلق ہے، حسن شوقی دبستان دکن کے باکمال متغزلین میں شمار کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے، دکنی غزل کے پس منظر میں شوقی کی غزل گوئی کا

بھرپور جائزہ لیا ہے اور اس کے مرتبے و مقام کا تعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس خصوص میں انھوں نے مختلف قلمی کتابوں کے دفینوں سے، متعدد جوہر گراں مایہ ڈھونڈ نکالے ہیں۔ اور فیروز، محمود، خیالی، سالک، اشرف، رحیمی، قریشی اور تائب کی بعض غزلوں کو پہلی بار منظرِ عام پر لایا ہے۔

قدیم اُردو کی قلمی بیاضوں میں املا کی عجیب و غریب شکلیں ملتی ہیں، جس کی وجہ سے مرتبِ متن کو قدم قدم پر دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یائے معروف، یائے مجہول اور ہائے سادہ، ہائے مخلوط میں کوئی امتیاز برتا نہیں جاتا بلکہ اکثر صورتوں میں ایک کی جگہ دوسری ملتی ہے۔ ڈاکٹر جالبی "دیوان حسن شوقی" میں املا کے سلسلہ میں اپنے طریق کار کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ۔

"زیادہ تر الفاظ میں نے اصل املا کے مطابق رہنے دیے ہیں۔ صرف ہ اور ھ کو بدلا ہے تاکہ پڑھنے میں آسانی ہو اور شعر آسانی سے وزن میں پڑھا جا سکے ص ۶۵

لیکن تصحیحِ متن کے لیے یہ اصول مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ اگر یائے معروف اور یائے سادہ کو صحیح شکل کے ساتھ نہیں لکھا گیا تو املا کا درج ذیل روپ سامنے آتا ہے، جس سے نہ صرف شعر کے سمجھنے میں دشواری ہو گی بلکہ غلط معنی و مفہوم کے استخراج کا بھی اندیشہ ہے۔

ع لے دن ہوئے سرِ جن مجہ تک پیتر نہ بھیجا
ص ۱۴۱

اس مصرع میں "لے" کی جگہ "لئی" (بمعنی زیادہ) ہونا چاہیئے

ع کسی تج باج بھل سوں تا اگر یوسف بھلاوے مجہ
ص ۱۶۵

اس مصرع میں "کسی" کے بجائے "کسے" (کسی کو) ہونا چاہیے۔

اسی طرح درج ذیل مصرعوں میں ہائے سادہ کی جگہ ہائے مخلوط ہونی چاہیئے۔

ع جیوں پتہر پر کی لیکھ جس کی بات
ص ۱۵۲
(پتھر)

ع کر کوتوں کسی سیں انوٹہی بات
ص ۱۵۲
(انوٹھی)

۶ دلبر سلونی نین پر کھینچے ہے سو کا خوبتر
(کھینچے) ص ۱۵۶

دیوان نصرتی :- دکنی ادب کی بازیافت کے سلسلہ میں ڈاکٹر جمیل جالبی کی دوسری اہم تحقیقی تدوین " دیوان نصرتی " ہے جو " دیوان حسن شوقی " کی اشاعت کے دوسرے سال ۱۹۷۲ء میں مطبع توسین لاہور سے شائع ہوی ۔ " دیوان نصرتی " کی موجودہ اشاعت سے پہلے مجلس ترقی ادب لاہور کے ماہنامے " صحیفہ " اکتوبر ۱۹۷۰ء کی اشاعت میں بھی اسے شامل کیا گیا تھا۔

ملک الشعراء نصرتی دبستان بیجاپور کا ایک بلند پایہ شاعر ہے۔ بحیثیت قصیدہ گو اور مثنوی نگار وہ دبستان دکن کے دو تین عظیم المرتبت شاعروں میں شمار ہوتا ہے۔ غزل گوئی کے میدان میں بھی اس نے اپنی بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس کی بے مثال عشقیہ مثنوی " گلشن عشق " کو مولوی عبدالحق اور سید محمد نے علی الترتیب ۱۹۵۲ء میں " انجمن ترقی اردو کراچی سے اور ۱۹۵۷ء میں سالار جنگ پبلشنگ کمیٹی حیدرآباد سے شائع کیا تھا جبکہ اس کی معرکتہ الآرا ۔ رزمیہ مثنوی " علی نامہ " کو عبدالمجید صدیقی نے ۱۹۵۹ء میں مرتب کر کے سالار جنگ پبلشنگ کمیٹی حیدرآباد سے شائع کیا ۔ " نصرتی " کے عنوان سے مولوی عبدالحق کی مرتبہ ایک کتاب ۱۹۴۴ء میں دہلی سے منظر عام پر آئی ۔

" دیوان نصرتی " میں " ڈاکٹر جمیل جالبی نے ۴۵۵ اشعار پر مشتمل مثنوی " تاریخ اسکندری " کے علاوہ ۴ قصیدے (۱۔ قصیدہ مرثیہ ۲۔ گھوڑا مانگنے کی درخواست ۔ ۳۔ قصیدہ ۴۔ ہجو سختور) ۲۰ مخمسات " ۲۳ غزلیں " ۲۸ رباعیاں " ۳۔ قطعات اور ایک فارسی غزل کو شامل کتاب کیا ہے۔ مقدمہ ۱۶ صفحات پر پھیلا ہوا ہے جس میں شاعر کے حالات زندگی اور خصوصیات کلام پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کلام کی اندرونی شہادتوں کی مدد سے نصرتی کے واقعات حیات کے بعض نئے گوشے زیر بحث لائے گئے ہیں " جیسے نصرتی کا خاندان " دکن میں آکر آباد ہو گیا تھا اور مقامی لوگ " اس خاندان کو اب بھی باہر کا خاندان سمجھتے تھے۔ وہ طبعی موت نہیں مرا " بلکہ حاسدوں نے اسے شہید کر دیا اور نجومیوں نے یہ پیش قیاسی بھی

کی تھی کہ اس کو جان کا خطرہ ہے۔ نصرتی کے سنہ وفات کے سلسلہ میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے ڈاکٹر زور کے دیئے ہوئے سال وفات ۱۰۸۱ھ سے اختلاف کرتے ہوئے مولوی نصیر الدین ہاشمی کے متعین کردہ سنہ وفات ۱۰۸۵ھ کو قرین قیاس مانا ہے اور درج ذیل شعر کے حوالے سے یہ بھی بتایا ہے کہ "تاریخ اسکندری" ۱۰۸۳ھ کی تصنیف ہے۔

سہس ہور اسی پر جو تھے تین سال

کرے یک میں بر سب زمانے نے حال

ڈاکٹر جالبی نے "نصرتی کی مثنویوں" "گلشن عشق" "علی نامہ" اور "تاریخ اسکندری" کی شعری، فنی ادبی لسانی خصوصیات کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ بحیثیت غزل گو اور قصیدہ نگار نصرتی کے کمالِ فن پر روشنی ڈالی ہے۔

یہاں تک تدوین متن کا تعلق ہے "دیوان نصرتی" میں ایک کمی یہ رہ گئی ہے کہ جالبی صاحب نے مولوی عبدالحق کی مرتبہ کتاب "نصرتی" کا تفصیلی تعارف نہیں کروایا اور بعض رسائل جن میں "نصرتی" کا غیر مطبوعہ کلام چھپا تھا، ان کی دسترس سے باہر رہ گئے۔ مولوی عبدالحق نے اپنی کتاب "نصرتی" میں" نہ صرف شاعر کے حالاتِ زندگی پر روشنی ڈالی ہے اور خصوصیاتِ کلام بیان کئے ہیں بلکہ نصرتی کی تین غزلیں (۲۵ اشعار)، ۷ رباعیاں، ۲ قطعات، دو قصیدے، ا قصیدہ ترجیع ۲۰ اشعار، ہجو سخنور ۲۷ اشعار، ایک مخمس (۶ بند) کے علاوہ مثنوی "تاریخ اسکندری" کے ۲۲۶ اشعار بھی پیش کیے ہیں۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ متذکرہ کتاب اور نصرتی کی مطبوعہ چیدہ چیدہ غزلوں کے متن کا بھی تقابلی مطالعہ کیا جاتا۔ یہاں تک نصرتی کی نودریافت غزلوں کا تعلق ہے، مولوی اکبرالدین صدیقی نے ماہنامہ "سب رس" حیدرآباد جنوری ۱۹۶۶ء میں نصرتی کی تین غزلیں "میٹھے بچن سناؤں" کے عنوان سے شائع کی تھیں بعد کو یہی مضمون ایک غزل کے اضافے کے ساتھ "بجھتے چراغ" میں بھی شامل کیا گیا۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر محمد ہاشم علی نے "نوائے ادب" بمبئی اپریل ۱۹۷۰ء میں نصرتی کی مزید تین غزلیں شائع کیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے "دیوان نصرتی" میں جملہ ۲۳ غزلیں شامل کی ہیں۔ اگر متذکرہ مضامین تک ان

کو رسائی حاصل ہوتی تو نصرتی کی غزلوں کی تعداد ۲۷ ہو جاتی۔ موجودہ صورت میں درج ذیل غزلیں اور بعض غزلوں کے چیدہ چیدہ اشعار "دیوان نصرتی" میں شامل نہیں ہو سکے۔

دسن سوں تجہ دہن اے دھن امولک گن گہر کا ہے
کہ ہر الماس صاف اس میں مگر ٹکڑا چندر کا ہے

(نوائے ادب بمبئی اپریل ۱۹۷۰ء)

دھن کالبد ہور گلا دیکھت ساقی مدام
مئے صراحی کی پچھاڑت تھے سٹتا ہے جام
(سب رس حیدرآباد جنوری ۱۹۶۶ء)

تھوڑی ہور کچہ تیری دیکھت کتا دل بے شکیب ابچھا
کدی کچہ بات میں نازک کدی تولیں میں سیب ابچھا
(سب رس حیدرآباد۔ جنوری ۱۹۶۶ء)

نا وزن نا تلازم نا قافیہ ردیف ہے
مہمل بچن سراسر جانو بحور جوڑا

("نصرتی"۔ مولوی عبدالحق ص ۲۱۶)

"دیوان نصرتی" "ڈاکٹر جالبی کی بیشتر کتابوں کی طرح ٹائپ میں شائع ہوی ہے۔ جس کی وجہ سے اس کتاب میں کمپوزنگ اور طباعت کی بے شمار غلطیاں راہ پا گئی ہیں مثلاً

ع دبی تھی سو آتش اوٹھی پھر سلگ (ص ۱۸ سطر ۸)
دبی کی جگہ ڈوبی چھپا ہے

ع نہ کر کچہ دھنی کے زباں پر نظر (ص ۲۱، سطر ۱۴)
نہ کر کی جگہ نر کر چھپا ہے

ع جماعت ہر زہ گویاں کی کدھر کو نچے میں گھر گھر ہے (ص ۵۲۔ سطر ۲)
کہر کی جگہ کدھر شائع ہوا ہے

ع کہ بنگی سطر لکھنے کن نکامی نیٹ مسطر ہے (صـ۵ـ۔ سطر ۲۴)

بنگی کی جگہ بنکی چھپا ہے

ع بولیا کہ لئی دنوں سیں تیری بندگی میں ہوں (صـ۶۲ـ۔ سطر ۷)

لئی دنوں کی جگہ " کئی دنو " چھپا ہے

ع بولی بتاں کے ہت تے تٹے تو حلال بول (صـ۶۲ـ۔ سطر ۱۰)

" کے ہت " کی جگہ " کی ہٹ " چھپا ہے

کمپوزنگ اور طباعت کی بے احتیاطی سے قطع نظر، بعض اشعار کے کھولنے میں جالبی صاحب سے سہو ہوا ہے جیسے " قصیدۂ جرخیہ " کے درج ذیل اشعار دیکھئے ؎

گونڈ کے یک باگ کوں مد میں جو بکریاں دکھے
شعر گوئی کا دوجا جھٹ کرے سب کو بھجن

سیر سوں جب سیر ہو شعر گوئی میں کیا
سبز بیابان تب پھیر کوں نکلے ہرن

(صـ۳۷ـ سطر ۹ تا ۱۲)

قصیدہ کے مضمون اور سیاق و سباق کو پیش نظر رکھیں تو پتا چلتا ہے کہ مذکرہ اشعار میں " شیر کے گوّی میں جانے " کا تذکرہ کیا گیا ہے " نہ کہ " شعر گوئی " کا۔ تھوڑی سی ترمیم کے بعد ان اشعار کی تشکیل یوں ہو گی ؎

گونڈ کے یک باگ کوں مد میں جو بکریاں دکھے
شیر گوّی کا دوجا جھٹ کرے سب کو بھجن
سیر سوں جب سیر ہو شیر گوّی میں گیا
سبز بیابان تب بھیر کو نکلے ہرن !!

مثنوی کدم راو پدم راو :- دکنی ادبیات کی تحقیق و تدوین کے سلسلے میں ڈاکٹر جالبی کا سب سے

اہم کارنامہ اُردو کی پہلی تصنیف مثنوی "کدم راو پدم راو" کی اشاعت ہے[1] اس مثنوی کا تعارف سب سے پہلے مولوی نصیر الدین ہاشمی نے ایک مضمون "بہمنی عہد حکومت کا ایک دکنی شاعر" مطبوعہ رسالہ "المعارف" اعظم گڑھ اکتوبر ۱۹۳۲ء کے ذریعہ کروایا تھا۔ اس کی اشاعت کے سلسلے میں ابتداً بابائے اردو مولوی عبدالحق نے بہت تگ و دو کی تھی۔ وہ زندگی بھر حکومت سے، اور زبان و ادب کے شیدائیوں سے دکنی اردو کی اس قدیم ترین کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں تعاون کی درخواست کرتے رہے۔ چوں کہ اس ہفت خواں کے طے کرتے میں دشواریاں بہت زیادہ تھیں۔ کامیابی کے امکانات موہوم تھے اور مالی منفعت کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اس لیئے کسی نے بھی اس بھاری پتھر کو ہاتھ لگانے کی ہمت نہیں کی۔ بالآخر ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس مہم کو سر کرنے کا بیڑہ اٹھایا اور مسلسل پانچ سات سال کی عرق ریزی اور چھان بین کے بعد اس مثنوی کا مکمل متن مرتب کر کے ۱۹۷۳ء میں انجمن ترقی اردو پاکستان کی جانب سے شائع کیا۔

اس مثنوی کا واحد نسخہ انجمن ترقی اردو پاکستان کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ چوں کہ مخطوطہ ناقص الاوسط و آخر ہے اس لیے قصے کے تسلسل کو سمجھنا دشوار ہے۔ انتہائی مشکل اور غیر معین رسم الخط اور زبان کی قدامت مرتب متن کے لیے مزید الجھن پیدا کرنے کا باعث بنتی ہے۔ ڈاکٹر جالبی نے جس دیدہ ریزی، جستجو اور لگن سے چھ سو سال قدیم کتاب کو مرتب و مدون کیا ہے۔ بقول جمیل الدین عالی اُس کی داد کھل کر نہ دینا ایک نا قابل معافی ادبی جرم ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کی تحقیق کے مطابق "کدم راو پدم راو" بہمنی خاندان کے نویں بادشاہ سلطان احمد شاہ ولی بہمنی (۱۴۲۱ء - ۱۴۳۴ء) کے عہد کی تصنیف ہے۔ شاعر نے اپنا نام "فخر دین" اور تخلص نظامی بتایا ہے۔

---

[1] اس کتاب کی ترتیب و تدوین پر مصنف کو شعبۂ اردو سندھ یونیورسٹی کی جانب سے ڈی۔ لٹ کی سند عطا کی گئی۔

مثنوی کا اصل نام معلوم نہیں ہو سکا۔ چوں کہ اس کا قصہ دو اہم کرداروں "کدم راؤ" (راجہ) اور "پدم راؤ" (وزیر) کے گرد گھومتا ہے، اس لیے اس کا نام "کدم راؤ پدم راؤ" مشہور ہو گیا۔

کدم راؤ پدم راؤ تقریباً چھ سو سال قدیم مثنوی ہے اس میں مقامی بولیوں کے علاوہ سنسکرت اور پراکرت کے الفاظ بھی شامل ہیں اس لیے آج کے قاری کے لیے اس کی زبان بہت مشکل اور عسیر الفہم معلوم ہوتی ہے۔ تاہم نظامی کی قادرالکلامی اور پرگوئی مسلم ہے۔ زبان کی کم مائیگی کے باوجود اس نے مثنوی میں ضرب الامثال اور محاورے بھی بڑی مہارت اور چابکدستی سے استعمال کیے ہیں۔ مثال کے طور پر چند نمونے دیکھئے۔

جو کچھ کال کرنا سو توں آج کر	نہ گھال آج کا کام توں کال پر
بڑے ساچ کہہ کر گیے لوک اچوک	ددھا دود کا چھاچھا پیوے پھوک
بڑے ساچ کہہ کر گیے گن شگن	گیہوں پیسنے پیسیا جاے گھن

"کدم راؤ پدم راؤ" کا مقدمہ کم و بیش ۶۰ صفحات پر محیط ہے جس میں ڈاکٹر جالبی نے زمانۂ تصنیف، مثنوی کا نام، حالاتِ مصنف اور مثنوی کے قصہ کے خلاصے کے علاوہ املا کی خصوصیات اور لسانی مطالعہ جیسے مباحث شامل کر کے اپنی علمی بصیرت اور ژرف نگاہی کا ثبوت دیا ہے۔ تاریخی اور لسانی نقطہ نظر سے بھی اس مثنوی کی اہمیت مسلم ہے۔

اس کتاب کی ایک اور اہم خصوصیت، جو زبان و ادب کی تحقیق کے سلسلہ میں قدر کی نگاہوں سے دیکھی جائے گی، یہ ہے کہ مرتب نے کتاب کی سیدھی جانب، اصل مخطوطے کے ایک صفحے کا عکس چھاپ دیا ہے اور اس کے مقابل کے صفحے پر اپنا کھولا ہوا متن پیش کیا ہے۔ جس کی مدد سے محققین بیک نظر، دونوں متون کا تقابلی مطالعہ کر سکیں گے۔ اسی طرح جالبی صاحب نے اہلِ علم کے لیے تحقیق و تدوین کے دروازے بند نہیں کیے۔ درج ذیل مقامات پر ڈاکٹر جالبی کے تیار کردہ متن سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ کیٹ بھاو تھیں مجہ اٹھے سیس اگ

بلندی چلے پاے تھیں سیس لگ صفحہ ۱۰۵، سطر ۲

دوسرے مصرعے میں چلے کے بجائے چلے ہونا چاہیئے۔

۲۔ تیولا نہ کتیلی پرن دیہ گا نٹھ صفحہ ۱۰۱، سطر ۴

تیولا کی جگہ پتولا اور کتیلی کے بجائے کتیلی ہونا چاہیئے۔

۳۔ کون پرس جو تا گرے پاؤں تھیں صفحہ ۹۶ سطر ۱

پرس کی جگہ پرک ہونا چاہیئے۔

۴۔ دنیا جھوٹ ہے جیونا جھونٹ جان صفحہ ۸۹ سطر ۲

اس مصرع میں جیونا کی جگہ "جیوناں" اور جھونٹ کے مقام پر "جھوٹ" ہونا چاہیئے۔

۵۔ نہ گل لاؤ مجہ کوں سدا سیو لک

تن اوجھل نہ کرنا پلک ڈھانک چک صفحہ ۷۷، سطر ۱۲

اس شعر کے پہلے مصرع میں "سیولک" ہونا چاہیئے اور دوسرے مصرع میں "کرنا" کی جگہ "کرناں" اور چگ کے بجائے "چک" ہونا چاہیئے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے کتاب کے آخر میں ۲۴ صفحات پر مشتمل، مشکل اور غیر مانوس الفاظ کی فرہنگ اور فہرست ماخذ کے علاوہ سلاطین بہمنی کے تعارف اور شخصیات کے تذکرے پر مبنی ضمیموں کو شامل کرکے "مثنوی کدم راو پدم راو" کی قدر و قیمت میں مزید اضافہ کر دیا ہے

قدیم اردو کی لغت : دکنی ادب کی بازیافت، تلاش و تحقیق اور تدوین متن کے علاوہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے مرکزی اردو بورڈ لاہور کی جانب سے ۱۹۷۳ء میں گیارہ ہزار الفاظ پر مشتمل قدیم اردو کی ایک لغت بھی مرتب کرکے شائع کی ہے۔ اس کتاب کی وجہ تالیف کا تذکرہ کرتے ہوئے جالبی صاحب لکھتے ہیں کہ "اس لغت کی داستان یہ ہے کہ "تاریخ ادب اردو" پر کام کرتے ہوئے مجھے سینکڑوں مخطوطات اور بیاضوں کے صحراؤں سے گزرنا پڑا۔ دوران مطالعہ اکثر ایسے

لفظوں سے واسطہ پڑا جو میرے لیے اجنبی تھے۔ میں ان لفظوں کو ایک کاپی میں لکھ لیتا اور پھر سیاق و سباق کے حوالے، مختلف لغات کی مدد اور اہل علم سے گفتگو کرنے کے بعد جب ان لفظوں کے معنی متعین ہو جاتے تو ان کے سامنے لکھ دیتا۔ کچھ عرصہ بعد میں نے یہ کیا کہ ہر وہ لفظ جو قدیم ادب میں استعمال ہوا، اسے معنی اور حوالے کے ساتھ، ایک کارڈ پر لکھ کر رکھ لیتا۔ یہ کام ۱۹۶۱ء میں شروع ہوا تھا اور ۱۹۷۱ء میں ختم ہوا۔ جب کام ختم ہوا تو تقریباً اٹھارہ ہزار الفاظ کا ذخیرہ میرے پاس تھا۔ اس ذخیرہ کو دیکھ کر میرے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر ان الفاظ کو مرتب کر دیا جائے تو یہ لغت ان لوگوں کے لیے یقیناً مفید ثابت ہوگی جو قدیم اردو کی مطبوعہ کتب، مخطوطات اور قلمی بیاضوں کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔ اسی خیال کے پیش نظر میں نے قدیم اردو کی یہ لغت مرتب کی ہے۔" اور اس طرح جمیل جالبی صاحب نے جو کام صرف و محض اپنی علمی پیاس بجھانے کے لیے کیا تھا وہ اب ایک مستقل حوالے کی کتاب کی حیثیت سے قدیم ادب کے طلبہ اور محققین کی رہنمائی کر رہا ہے۔

قدیم اردو کی پہلی لغت سید شاہ اشرف بیابانی (۹۳۵ھ/ ۱۵۲۹ء) کی "واحد باری" ہے یہ لغت منظوم ہے اور اس میں عربی اور فارسی الفاظ کے مترادفات اس وقت کی مروجہ زبان (دکنی اردو) میں درج کئے گئے ہیں۔ اٹھارویں صدی کے ربع آخر میں شاہ محی الدین نے "کنز الفوائد" کے نام سے ایک لغت مرتب کی تھی" جس میں فارسی الفاظ کے معنی قدیم اردو میں تحریر کئے گئے تھے۔ ۱۹ ویں صدی کے ربع دوم میں نیاز علی بیگ نے "مخزن الفوائد" کے نام سے فارسی اور قدیم اردو کی لغت مرتب کی تھی۔ ان ابتدائی کتب لغت کے علاوہ دکنی اردو کی باضابطہ لغت نگاری کے سلسلہ میں عارف ابوالعلائی کی "دکن کی زبان" (۱۳۵۴ھ/۱۹۳۵ء) مسعود حسین خاں و غلام عمر خاں کی "دکنی اردو کی لغت" (۱۹۶۹ء) سید شعار احمد کی دکنی لغت (تاریخ اشاعت ندارد)۔ سید ابوتراب خطائی ضامن کی "دکنی لغات" (۱۹۷۰ء) امیر عارفی کی "دکنی فرہنگ" (۱۹۷۲ء)۔ جمیل جالبی کی "قدیم اردو کی لغت" ۱۹۷۳ء اور ڈاکٹر جاوید وششٹ کی "دریائے معانی" اہمیت کی حامل ہیں۔ ان تمام کتب لغت میں

ذخیرۂ الفاظ کے نقطہ نظر سے سب سے وقیع اور قابل قدر کتاب ڈاکٹر جمیل جالبی کی "قدیم اُردو کی لغت" ہے۔

"قدیم اُردو کی لغت" میں دسویں گیارہویں اور بارہویں صدی ہجری کے ربع دوم تک کے قدیم اُردو مخطوطات اور مطبوعہ کتابوں کے مشکل الفاظ و تراکیب کے معنی اور ان کے مترادفات درج کیے گئے ہیں۔ جالبی صاحب نے قدیم زبان وادب کے محققوں اور طالب علموں کی سہولت کی خاطر یہ بہت مفید کام کیا کہ ایک ہی لفظ کی مختلف املائی شکلیں۔ مصدر، حاصل مصدر، امر ماضی مطلق، مرکبات مشتقات کی بیشتر شکلیں شامل کتاب کر دیں۔ جیسے۔

"بھاگنا یا" فرار ہونا" کے لیے قدیم الفاظ کے درج ذیل روپ لغات میں موجود ہیں ٹھاٹ (بھاگنا)۔ ٹھاٹنا (بھاگنا، دغا دینا)۔ نھاٹیا (بھاگا، دوڑا)۔ نھاس (بھاگ) نہاستا، نھاستا (بھاگنا، فرار ہونا، غائب ہونا، روپوش ہونا)۔ نھانٹ (بھاگ)۔ نھانٹنا (بھاگنا، فرار ہونا)

کبھی اور کب کے لیے دکنی اُردو میں "کد" کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اس کی درج ذیل شکلیں جمیل جالبی نے پیش کی ہیں۔

کد (کبھی، کب، کس وقت)۔ کداں (کب)۔ کدھی (کبھی)۔ کدن (طرف)۔ کدھاں (کب)۔ کدھاں لگ (کب تک) کدھن، کدہن (طرف، سمت، کس طرف) کدھی (کبھی)۔ کدی (کبھی)

اسی طرح املا کی مختلف صورتوں جیسے سیا۔ صبا۔ صباح وزا۔ وضا اور وضع سور، سوریج، سُرج وغیرہ کے معنی درج کر کے قارئین کے لیے بڑی سہولت پیدا کر دی ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے تن تنہا اس مشکل اور صبر آزما کام کی تکمیل کی ہے جب کہ کتب لغت کی تدوین کا کام محققین اور ماہرین زبان کی جماعت یا ادارے انجام دیتے ہیں۔ لیکن پھر بھی اس نوعیت کی کسی بھی مساعی کو حرفِ آخر نہیں کہا جا سکتا۔ جالبی صاحب کی مرتبہ لغت ذخیرۂ الفاظ کی وسعت کے لحاظ سے قدیم اُردو کی بہترین لغت ہے تاہم

اس میں درج ذیل الفاظ جگہ نہیں پا سکے۔

۱۔ بنگا (ٹیڑھا) بنگی (ٹیڑھی) ع

ع نوا چاند بنگی کھرک ہے کہ جان (دیپک پتنگ)

۲۔ پنج (پیدائش) پنچتا (پیدا ہوا) پنچیا (پیدا ہوا)

ع پنج فاضلاں کا ہے اس ٹھار میں (قطب مشتری)

ع نہ منچے نہ پنچیا ہے اس ٹھان میں (سیف الملوک و بدیع الجمال)

۳۔ پھاڑ (پہاڑ)۔ پھاڑاں (پہاڑ کی جمع)۔ پھاڑے پھاڑ (پہاڑ پہاڑ)

کنکر میں گھوس کر پھاڑ کوں کون دیکھیا ہے (سب رس)

دانش کے تیشے سوں پھاڑاں الٹایا تو لیو شیریں پایا (سب رس)

۴۔ ڈرا (صاحب، مالک، آقا۔ کلمۂ تخاطب)

کیتا کہنا ڈرا ڈرا۔ خوب سوں خوب برے سوں برا (سب رس)

۵۔ ستی (سے)۔ سیتی (سے)

طلب کرنا اللہ کا فرض ہے، سب فرضاں ستی اول ہے (معراج العاشقین)

ع ہوا پرگٹ جد حال سیتی دنیا ہور دین قدرت سوں (کلیات محمد قلی)

ان لفظوں کی عدم شمولیت سے "قدیم اردو کی لغت" کی اہمیت اور افادیت میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ یہ لغت دراصل محققین، ماہرین زبان اور اہل علم کے نشانِ راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے مطالعہ کے بغیر مستقبل میں کسی بھی قدیم اردو کی لغت کی ترتیب و تدوین ادھوری اور نامکمل رہے گی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے ایک ایک لفظ کے مختلف ماخذ سے جتنے اور جس قدر بھی معانی سامنے آتے گئے ہیں ان سب مترادفات کو اسی لفظ کے ذیل میں درج کر کے بڑی آسانی پیدا کر دی ہے۔ ذیل میں صرف دو لفظوں کے مترادفات نمونتاً پیش کئے جاتے ہیں۔ جن سے جالبی صاحب کی دیدہ ریزی، وسعت مطالعہ، محنت، لگن، تحقیق و تدقیق اور چھان بین کا اندازہ ہوگا۔

بھان : (۱) محسوس ہوتا، معلوم ہوتا
(۲) سورج، صبح، روشن (۲) بہن، خواہر

بھانا : ڈالنا، پھینکنا، ہونا، گرانا، اچھا لگنا، پسند آنا، بہاتا، دریا، برداشت کرنا، بہانہ

ست : عصمت، طاقت، زور، سچائی، عرق، رس، خوبی، فضیلت، نیکی، سادھو، مردِ نیک، پاک، اعلیٰ

ست : (۱) خلاصہ (۲) فرزند (۳) گناہ، بدی

تاریخ ادب اردو (جلد اول) ڈاکٹر جمیل جالبی نے جہاں دکنی اُردو کے متون کی بازیافت اور تنقیدی تدوین کا قابلِ قدر کام انجام دیا ہے، قدیم اُردو لغت مرتب کر کے علم و آگہی کی روشنی پھیلائی ہے وہیں تاریخ ادب اُردو کی تدوین جیسے دشوار گذار اور صبر آزما کام کا بیڑہ بھی اٹھایا ہے۔[1]

تاریخ ادب کے بارے میں کچھ اچھے ہوئے اشارے سب سے پہلے تذکروں میں ملتے ہیں۔ اس کے بعد علاقائی ادب کو موضوع بنانے کا رجحان مقبول ہوتا گیا اور پھر ادوار کی بنیاد پر یا اصناف ادب کے اعتبار سے تاریخ ادب کو اجاگر کرنے کی کوشش سامنے آتی ہیں۔ جیسے آبِ حیات، "گل رعنا"، "دکن میں اردو"، "پنجاب میں اردو"، "دبستان دہلی"، "دبستان لکھنو"، "اردو غزل کا نشو و نما"، "اردو مثنوی کا ارتقا" وغیرہ۔ جہاں تک قدیم اردو ادب کی تاریخ کا تعلق ہے اس سلسلہ میں "اُردوے قدیم" (حکیم شمس اللہ قادری)، "اُردو شہ پارے" (ڈاکٹر زور)، "دکن میں اُردو" (نصیر الدین ہاشمی)، "پنجاب میں اُردو"

---

[1] تاریخ ادب اُردو (جلد اول) کی ترتیب پر ڈاکٹر جالبی کو سندھ یونیورسٹی سے پی ایچ۔ ڈی کی سند عطا کی گئی۔ (م - ع - ا)

(محمود شیرانی) ۔ "دکنی ادب کی تاریخ" (محی الدین قادری زور) اور " علی گڑھ تاریخ ادب اردو" کے نام قابلِ ذکر ہیں ۔ ان کتابوں کی افادیت اور اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن بقول مشفق خواجہ "ڈاکٹر جمیل جالبی کی مرتبہ " تاریخ ادب اردو" اپنے موضوع پر پہلی مستند اور مفصّل کتاب ہے ۔کیوں کہ مصنف نے محض پچھلی کتابوں کے بیانات کو دہرایا ہے اور نہ تذکرہ نگاری کے عام انداز کو اپنایا ہے بلکہ اصل ماخذ سے ، جس میں مخطوطات کی قابلِ لحاظ تعداد شامل ہے ، استفادہ کیا ہے۔ اس کتاب کی سب سے اہم خصوصیات یہ ہے کہ مصنف نے مطالعۂ فکر ، تحقیق و تنقید کے حسین امتزاج سے ایک نئے اسلوب کی نیو ڈالی ہے ، جو توانا بھی ہے اور دل کش اور دلآویز بھی ۔

پیشِ نظر کتاب (تاریخ ادب اردو جلد اول) آغاز سے لے کر ۱۷۵۰ء تک کے ادب کی تاریخ کا احاطہ کرتی ہے ۔کتاب کی شان نزول کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں کہ" اب تک جتنی ادبی تاریخیں لکھی گئی ہیں ان میں مختلف علاقوں کا " قدیم اردو ادب" الگ الگ اکائی کی حیثیت رکھتا ہے گویا سب الگ الگ جزیرے ہیں ، جن کے ادب و زبان کے مطالعہ کا مجموعی نام تاریخ ادب رکھ دیا گیا ہے۔ میرے لیے یہ بات قابل قبول نہیں تھی کہ گجرات ، دکن اور شمال کا ادب الگ الگ جزیروں کی حیثیت رکھتا ہے اور ایک کا تعلق دوسرے سے کچھ نہیں ، پوری کتاب میں اسی جذبے اور تصور کی ترجمانی نمایاں طور پر نظر آتی ہے ۔ ابتداً تمہید کے طور پر اردو زبان اور اس کے پھیلنے کے اسباب بیان کئے گئے ہیں اور پھر زمانے کی ترتیب کے لحاظ سے کتاب کو چھ فصلوں میں تقسیم کیا گیا ہے پہلی فصل ۱۰۵۰ء سے ۱۷۰۷ء تک کا احاطہ کرتی ہے ۔ جس میں درج ذیل ابواب کے تحت شمالی ہند میں اردو زبان و ادب کے ارتقا اور اس کے ابتدائی نمونوں کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے ۔

۱۔ مسعود سعد سلمان سے گرو نانک تک (۱۰۵۰ء ـ ۱۵۲۵ء)

۲۔ بابر سے شاہجہان تک (۱۵۲۵ء ـ ۱۶۵۷ء)

۳۔ دورِ اورنگ زیب (۱۶۵۷ء۔ ۱۷۰۷ء)

پہلی فصل میں جن صوفیوں، مذہبی رہنماؤں، ادیبوں اور شاعروں کے اقوال، فقرے، جملے یا شاعری کے نمونے پیش کیے گئے ہیں ان کے نام ہیں مسعود سعد سلمان (۱۰۴۶ء۔ ۱۱۲۱ء) امیر خسرو (۱۲۵۳ء۔ ۱۳۲۵ء) امیر حسن دہلوی (م ۱۳۳۷ء) شیخ فریدالدین مسعود گنج شکر (۱۱۷۳ء۔ ۱۲۶۵ء) خواجہ نظام الدین اولیاؒ (م ۱۳۲۵ء) شیخ شرف الدین یحییٰ منیری (م ۱۳۸۰ء) شیخ عبدالقدوس گنگوہی (۱۴۵۵ء۔ ۱۵۳۸ء)۔ نام دیو (۱۲۷۰ء۔ ۱۳۵۰ء) کبیر (م ۱۵۱۸ء) گرو نانک (۱۴۶۹ء۔ ۱۵۳۸ء) ظہیرالدین محمد بابر (م ۱۵۳۰ء) شیخ جمالی کنبوہ (م ۱۵۳۵ء) حکیم یوسفی۔ اچے چند بھٹنا گر اجیچند۔ پیر روشان (م ۱۵۷۲ء) بہرام سقہ بخاری۔ عشقی خاں عشقی (م ۱۵۸۲ء) نورالدین جہانگیر (۱۶۰۵ء۔ ۱۶۲۷ء) محمد افضل پانی پتی (م ۱۶۲۵ء)۔ منشی ولی رام وتی۔ پنڈت چندر بھان برہمن (۱۵۷۴ء۔ ۱۶۶۲ء)۔ میر عبدالواسع ہانسوی۔ شیخ عبداللہ انصاری۔ شیخ محبوب عالم۔ ناصر علی سرہندی (م ۱۶۹۷ء)۔

دوسری فصل میں چار ابواب کے تحت "گجری ادب اور اس کی روایت" کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس فصل کا پہلا باب، پانچویں صدی ہجری سے آٹھویں صدی ہجری تک (۱۰۵۰ء۔ ۱۴۰۰ء) کی ادبی تاریخ پر مبنی ہے۔ دوسرے باب میں نویں اور دسویں صدی ہجری کے ملفوظات، لغات اور کتبوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ (۱۴۰۰ء۔ ۱۶۰۰ء) تیسرے باب کا عنوان نویں اور دسویں صدی ہجری کی ادبی روایت (۱۴۰۰ء۔ ۱۶۰۰ء) جس میں شیخ بہاالدین باجن (۱۳۸۸ء۔ ۱۵۰۶ء) قاضی محمود دریائی (۱۴۶۹ء۔ ۱۵۳۴ء) شاہ علی محمد جیو گام دھنی (م ۱۶۶۵ء) شیخ خوب محمد چشتی (م ۱۶۱۴ء) کی تصانیف سے بحث کی گئی ہے اور ان کے ادبی مقام کا تعین کیا گیا ہے۔ چوتھے باب میں دسویں، گیارہویں اور بارہویں صدی ہجری کے اوائل میں اردو روایت (۱۶۰۰ء۔ ۱۷۰۷ء) سے بحث کی گئی ہے۔ اس باب میں سید محمد مہدی (م ۱۵۰۴ء) میاں مصطفیٰ گجراتی (م ۱۵۷۶ء) سید اسحٰق سرمست (۱۶۰۵ء)

عالم گجراتی (م ۱۶۷۶ء) امین گجراتی ۔ محمد فتح بلخی کے ادبی کارنامے زیر بحث آئے ہیں۔

تیسری فصل "بہمنی دور میں اردو ادب (۱۳۵۰ء ۔ ۱۵۲۵ء) کی نشوونما پر مشتمل ہے۔ اس کو تین ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں پس منظر، ماخذ اور ادبی و لسانی خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دوسرا باب نویں اور دسویں صدی ہجری کے اوائل میں گلبرگہ اور بیدر میں فروغ پانے والے ادب کے جائزے پر مبنی ہے۔ اس باب میں اردو کی پہلی تصنیف "مثنوی نظامی" المعروف بہ کدم راو پدم راو، کے مصنف فخردین نظامی بیدری کے علاوہ، میراں جی شمس العشاق (م ۱۴۹۶ء) اور سید شاہ اشرف بیابانی (۱۴۵۹ء ۔ ۱۵۲۸ء) کی تصانیف کا مفصل ادبی اور لسانی جائزہ لیا گیا ہے۔ "ڈاکٹر جالبی نے" ڈاکٹر حفیظ قتیل کی تحقیق سے اتفاق کرتے ہوئے "معراج العاشقین" کو خواجہ بندہ نواز کی تصنیف نہیں مانا اور یہ بھی بتایا ہے کہ خواجہ صاحب نے قدیم اردو یا دکنی میں کوئی بھی تصنیف اپنی یادگار نہیں چھوڑی۔

اس باب میں جالبی صاحب نے مشتاق بیدری، لطفی اور قریشی بیدری کو جگہ نہیں دی۔

چوتھی فصل میں، عادل شاہی دور (۱۴۹۰ء ۔ ۱۶۸۵ء) میں اردو شعر و ادب کے ارتقا پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کا پہلا باب پس منظر، روایت اور ادبی و لسانی خصوصیات کا احاطہ کرتا ہے۔ دوسرے باب میں "گجری روایت کی توسیع، ہندوی روایت کا عروج" برہان الدین جانم (م ۱۵۸۲ء) ابراہیم عادل شاہ ثانی (۱۵۸۰ء ۔ ۱۶۲۷ء) سید شہباز حسینی قادری (م ۱۶۰۶ء) اور خواجہ محمد دہدار فانی (۱۵۴۰ء ۔ ۱۶۰۷ء) کے ادبی کارناموں کو روشنی میں لایا گیا ہے۔ اس خصوص میں فانی کا کلام پہلی بار منظر عام پر آیا ہے۔ تیسرے باب کا عنوان "ہندوی و فارسی روایت کی کشمکش" (۱۶۲۷ء ۔ ۱۶۶۰ء) ہے جس میں مرزا محمد مقیم ۔ مقیمی اور محمد بن احمد عاجز کے ادبی کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے محی الدین قادری زور، ڈاکٹر نصیر الدین ہاشمی اور محمد اکبر الدین صدیقی کے اس بیان سے اختلاف کیا ہے کہ فارسی کے مشہور شاعر مرزا محمد مقیم کا تخلص مقیمی تھا اور مدلل طور پر ثابت کر دکھایا ہے کہ "مرزا محمد مقیم اور مقیمی دو الگ الگ شخص ہیں۔

اول الذکر بیجاپور میں سلطان محمد عادل شاہ کے دربار سے وابستہ تھا اور فارسی کا خوش گو شاعر تھا جس نے قلعہ پھری کی فتح کے موقع پر "فتح نامہ" مرتب کر کے بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ اور معصمی "چندر بدن و مہیار" کا مصنف ہے جس نے کم از کم ایک فارسی مثنوی بھی لکھی ہے۔" اسی طرح محمد بن احمد عاجز کے واقعاتِ حیات اور اس کی مثنویوں "یوسف زلیخا" (۱۶۳۴ء) اور "لیلیٰ مجنوں" (۱۶۳۶ء) کا مفصل جائزہ لیتے ہوئے پہلی بار یہ انکشاف کیا ہے کہ عاجز، شیخ احمد گجراتی کا بیٹا تھا، جس نے اپنے والد کی طرح "یوسف زلیخا" اور "لیلیٰ مجنوں" کے عنوان سے دو مثنویاں اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ عاجز کی "یوسف زلیخا" ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ اس مثنوی کا ایک قلمی نسخہ انجمن ترقی اُردو پاکستان کے کتب خانے کی زینت ہے۔ چوتھے باب میں، ملک خوشنود۔ امین۔ شاہ دولت۔ کمال خاں رستمی اور صنعتی کی مثنویوں اور غزلوں کا ادبی اور تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ ملک خوشنود کے بارے میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے پہلی بار تفصیلی معلومات فراہم کی ہیں اور اس کی مثنوی "جنت سنگار" کے دو نسخے دریافت کر کے اشعار کی تعداد (۳۲۲۵) بھی متعین کر دی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ملک خوشنود کو بحیثیت غزل گو بھی پہلی بار متعارف کرواتے ہوئے اس کی بعض غزلیں بھی شائع کی ہیں۔ اس باب میں رستمی کی غزل کے اشعار بھی پہلی بار منظر عام پر آئے ہیں۔ پانچویں باب میں "غزل کی روایت کا سراغ" کے موضوع کے تحت حسن شوقی کی غزل گوئی اور مثنوی نگاری کا سیر حاصل جائزہ لیا گیا ہے۔ اور دسویں اور گیارہویں صدی ہجری میں اُردو غزل کا سراغ لگاتے ہوئے نہ صرف شوقی کے تغزل پر روشنی ڈالی گئی ہے بلکہ اس کے ہم عصر اور زمانہ مابعد کے شاعروں پر اس کے اثرات کی نشاندہی بھی کی ہے۔ چھٹے باب "مذہبی تصانیف پر فارسی اثرات" میں شیخ غلام محمد داول شیخ محمود خوش دہاں اور امین الدین اعلیٰ کی نظم و نثر سے بحث کی گئی ہے۔ ساتویں باب "دکنی ادب کا عروج" میں علی عادل شاہ ثانی شاہی اور ملک الشعرا نصرتی کے کلام کا تفصیلی تذکرہ کیا گیا ہے۔ آٹھواں باب "نیا عبوری دور" میاں خاں ہاشمی، محمد امین ایاغی اور مرزا بیجاپوری کی غزلوں، ریختیوں، مثنویوں اور مرثیوں کے تحقیقی و تنقیدی جائزے پر مبنی ہے اس باب

میں ایاغی کی غزلیں اور ہاشمی کی "مثنوی عشقیہ"، "معراج نامہ" اور مخمس در نعت و مدح مہدی جونپوری ڈاکٹر جالبی کی دریافت ہیں۔

پانچویں فصل، قطب شاہی عہد (۱۵۱۸ء-۱۶۸۶ء) کے شعر و ادب کے جائزہ پر مشتمل ہے۔ اس کو سات ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں پس منظر، روایت اور ادبی و لسانی خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔ دوسرے باب "فارسی روایت کا آغاز" میں دبستان گولکنڈہ کے اولین غزل گو شعرا فیروز، "محمود" اور ملا خیالی کی شاعری پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں مصنف نے متذکرہ شاعروں کی غزلیں انجمن ترقی اردو پاکستان کے ذخیرہ مخطوطات سے پہلی بار شائع کی ہیں۔ تیسرا باب محمد قلی قطب شاہ اور شیخ احمد گجراتی کی ادبی خدمات کے جائزہ پر مبنی ہے۔ ڈاکٹر جالبی نے اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر کے رنگ تغزل کے بعض نئے گوشوں کو پہلی بار موضوع بحث بنایا ہے۔ اس باب میں احمد گجراتی اور اس کی تصانیف کا پہلی بار تفصیلی تعارف پیش ہوا ہے۔ چوتھے باب "فارسی روایت کا عروج" میں اسد اللہ وجہی کی نظم و نثر سے متعلق تصانیف پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔ ڈاکٹر جالبی مختلف شواہد اور دلائل کی روشنی میں تاج الحقائق کو وجیہ الدین محمد کی تصنیف قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس کتاب کو وجہی سے منسوب کرنا "تحقیقی اندھیر" ہے۔ پانچویں باب "فارسی روایات کی توسیع" میں سلطان عبداللہ قطب شاہ، ملک الشعرا ملا غواصی، قطب زاری، ابن نشاطی، جنیدی، بلاقی وغیرہ وغیرہ کے ادبی کارناموں سے بحث کی گئی ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ عبداللہ قطب شاہ کا بیشتر کلام ملک الشعرا غواصی کا کہا ہوا ہے۔

ڈاکٹر جالبی نے قطب زاری کے سلسلہ میں اس غلط فہمی کا ازالہ کیا ہے کہ قطبی و زاری (رازی نہیں) ایک ہی شخص کا نام نہیں بلکہ دو الگ الگ شاعر ہیں۔ قطب زاری "تحفۃ النصائح" کا مصنف ہے جب کہ "مینا نامہ" اور "چڑیا نامہ" قطبی کی منظومات ہیں۔ چھٹے باب "فارسی روایت کی تکرار" میں ابوالحسن تانا شاہ، طبعی، محب، مختار، فتاحی، شغلی، ضعیفی، خواصی، سیوک، اولیا، فائز وغیرہ کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ساتواں باب "دکنی روایت کا تمام" ... نوری، تحری اور باقر آگاہ کی تصانیف نظم و نثر کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ

لیا گیا ہے۔

چھٹی اور آخری فصل میں "فارسی روایت کا نیا عروج" کے زیر عنوان دو ابواب میں ولی دکنی اور اس کے معاصرین۔ فراقی۔ آزاد۔ داؤد اور سراج کی شاعری کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ ولی دکنی کی تاریخ وفات سے بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی نے چند ایسی دلیلیں اور شواہد پیش کئے ہیں کہ ۱۱۳۳ھ تک اس کے بقید حیات رہنے میں شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی حالانکہ ولی کا سنہ وفات ۱۱۱۹ھ تسلیم کیا جاتا ہے اور مولوی عبدالحق نے ایک قطعہ تاریخ کے دستیاب ہونے کے بعد اس بحث کا اختتام کر دیا تھا۔

"تاریخ ادب اردو" کی فہرست مضامین اور اشاریے پر سرسری نظر ڈالنے سے ہی جالبی صاحب کی دیدہ ریزی اور مطالعہ کی وسعت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کی تیاری کے سلسلہ میں انہوں نے صرف مطبوعہ تذکرے، تاریخیں یا شعر و ادب سے متعلق تحقیقی و تنقیدی تصانیف کے مطالعہ پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ متعدد قلمی بیاضوں اور مخطوطات کا دقت نظر سے مطالعہ کر کے مصنف سے براہ راست استفادہ کیا ہے۔ اسی لیے جالبی صاحب کے بیان میں قطعیت اور خود اعتمادی کی شان نظر آتی ہے۔

اس کتاب میں قدیم اردو کے متعدد شاعروں اور نثر نگاروں کو پہلی بار متعارف کروایا گیا ہے۔ بعض نامور سخنوروں کے نئے شعری اور فنی گوشوں کو پہلی بار ابھارا ہے" محمد گجراتی، حسن شوقی، فراقی اور شاہ تراب کے متعلق پہلی بار تفصیلی معلومات اس کتاب میں یکجا کی گئی ہیں۔ شاہ تراب اور ولی دکنی کے بارے میں بعض مفروضات اور مسلّمات کو بدیہی طور پر غلط ٹھہرایا گیا ہے۔ غرض قدیم اردو ادب کے موضوع پر یہ سب سے اچھی مستند اور معتبر کتاب ہے۔ تسلسل بیان۔ تقابلی جائزہ اور لسانی مطالعہ کے علاوہ تحقیق کو تنقید سے ملا کر ایک جان کرنے کا رجحان اور دل کش و دل آویز اسلوب اس کتاب کی سب سے اہم اور نمایاں خصوصیت ہے۔[1]

[1] (بہ فرمائش جناب سہیل احمد خاں۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔ دہلی)

۱۹۲

نئی تحریریں۔ ایک مطالعہ

اردو تنقید و تحقیق میں پروفیسر عبدالستار دلوی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں. وہ اردو کے خاموش خدمت گزاروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ پروفیسر دلوی صاحب بے نظیر محقق، بلند پایہ نقاد اور ماہرِ لسانیات ہیں۔ ان کی محنت دیدہ ریزی اور انہماک کا اندازہ اردو تحقیق، تدوینِ متن، لسانیات اور دکنیات کے موضوع پر ان کی مرتبہ کتابوں سے لگایا جا سکتا ہے۔ "اردو میں لسانیاتی تحقیق"۔ "ادبی اور لسانی تحقیق، اصول اور طریقِ کار" اور "دکنی اردو" پروفیسر دلوی کی مرتبہ ایسی تصانیف ہیں، جنھیں کتبِ حوالہ کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ دلوی صاحب کی دیگر مطبوعات میں "انتخابِ کلامِ چکبست"۔ "من سمجھاون"۔ "انتخاب مصحفی" "رانی کیتکی کی کہانی"۔ "امرت بانی"۔ "گھر آنگن" اور "ساوتری" (مراٹھی ناولٹ کا اردو ترجمہ) کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ آخرالذکر کتاب پر انھیں مہاراشٹر اکا ساہتیہ اکیڈمی انعام بھی مل چکا ہے۔ لسانیات، تحقیق اور تنقید کے موضوع پر پروفیسر دلوی

کے مقالات اور مضامین ملک اور بیرون ملک کے موقر رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ہندوستانی زبان اور لسانیات سے متعلق ان کے بعض اہم مطبوعہ مضامین درج ذیل ہیں۔

"بمبئی کی اردو" ۔ "بچوں کی اردو" ۔ "تحصیل زبان کا مطالعہ" ۔ "ہندوستان کا لسانی مسئلہ" ۔ "ہندوستان کے لیے لسانی یکجہتی کا تصور اور گاندھی جی" ۔ "اردو کا ہندوستانی رجحان" ۔ "اردو کے لسانی آداب" ۔ "اردو' ہندا اور اودھی" ۔ دکنی اردو پر مراٹھی کا اثر" ۔ ان مضامین کو برِ صغیر ہند و پاک کے علمی اور ادبی حلقوں میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا۔

ڈاکٹر عبد الستار دلوی نے سنیتی کمار چٹرجی اور ڈاکٹر وی۔ کے۔ آر۔ وی راؤ کی کتابوں MANY LANGUAGES اور INDIA: A POLYGLOT NATION AND ONE NATION کا پیش لفظ بھی تحریر کیا تھا جسے خود مصنفین نے بھی پسند کیا۔

پیش نظر کتاب "نئی تحریریں" مجموعہ ہے پروفیسر دلوی کے گیارہ فکر انگیز ادبی' تحقیقی اور تنقیدی مضامین کا جو گزشتہ پچیس سال کے عرصے میں اردو کے معتبر اور موقر رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان میں سے جیسا کہ خود مصنف نے لکھا ہے' بعض مقالات فرمائشی ہیں جو کلیتی ضروریات کے پیشِ نظر تحریر کیے گئے ہیں اور چند مضامین ایسے بھی ہیں جو خود مصنف کے اپنے علمی و ادبی شغف اور لسانی شعور کے نتیجہ کے طور پر معرض وجود میں آئے ہیں۔ ان مضامین اور مقالات کا سب سے نمایاں وصف یہ ہے کہ ان کے مطالعہ سے قاری پر مہاراشٹرا اور بمبئی کا علاقائی رنگ و روپ اور مقامی قد آور شخصیات کا گہرا تاثر ابھرتا ہے "نئی تحریریں" میں بمبئی سے متاثر ہونے والے یا بمبئی میں قیام کرنے والے شاعروں اور ادیبوں کے علاوہ بمبئی یا مہاراشٹرا کی اہم علمی و ادبی شخصیتوں کے بارے میں درجِ ذیل مضامین شامل ہیں۔

۱۔ اقبال اور بمبئی ۲۔ پریم چند کا قیام بمبئی۔ ۳۔ سکندر علی وجد فنون لطیفہ کا شاعر
۴۔ پروفیسر نجیب اشرف ندوی ۔ علمی زندگی کے تین دور ۵۔ ندوی صاحب شخصیت اور کردار
۶۔ وشنو سکھا رام کھانڈیکر

متذکرہ مضامین کے علاوہ "شبلی مکتوب نگار کی حیثیت سے" بھی ایک ایسا مضمون ہے جس کا رشتہ 'مہاراشٹر اور بمبئی کے علمی اور ادبی حلقوں سے بہ آسانی جوڑا جا سکتا ہے۔
بمبئی ابتدا ہی سے اردو کا مرکز رہا ہے اور اس کی تجارتی اور ثقافتی حیثیت بھی مسلم ہے۔ شہر بمبئی کی علمی اور تہذیبی حیثیت کا تذکرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر دلوی رقم طراز ہیں۔

"شہر بمبئی کو ہندوستان کے دیگر شہروں کے مقابلہ میں گذشتہ تقریباً دوسو سال سے ایک امتیازی حیثیت حاصل رہی ہے۔ ابتداً اس کی اس اہمیت کی وجہ اس کا جغرافیائی محل و قوع تھا جسے بعد میں اس کی صنعتی اور تجارتی حیثیت نے اور جلا دی۔ اسے ہندوستان کا دروازہ بھی کہا گیا کہ اسی کے راستے سے ہندوستان نے اپنے تعلقات کو بیرونی ممالک کے ساتھ وسعت دی۔"

قرۃ العین حیدر نے بمبئی کی آزاد خیالی اور اہل بمبئی کی آرٹ سے دل چسپی کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک بار کہا تھا۔

"فنون لطیفہ اور ادب کی آبیاری کے لیے جس آزاد خیالی کی ضرورت ہے وہ فضا مہاراشٹر میں ملتی ہے۔ ہمیں اعتراف کرنا چاہیے کہ ترقی پذیر ریاستوں میں شہر بمبئی کی روشن خیالی سارے برصغیر میں بطور مثال پیش کی جا سکتی ہے۔ بمبئی میں مختلف فرقوں کے کلچرل، فکشن، ڈرامہ، موسیقی، فلم پرفارمنگ آرٹ کی فضا ساز گار ہے۔" [۱]

---

[۱] "اردو والوں کے چالیس سال"۔ رپورٹ۔ جی۔ ایم۔ خان۔ بحوالہ "ہماری زبان" دہلی یکم مارچ ۹۱ء ص۸

مہاراشٹر اور بمبئی کی علمی و ادبی فضاؤں اور مقامی شخصیات سے متعلق ان مقالات
مضامین میں پروفیسر دلوی نے اپنی ژرف نگاہی اور تحقیقی بصیرت کا ثبوت دیتے ہوئے
ام منتشر اور بکھرے ہوئے مواد کو بڑی مہارت اور چابکدستی سے یکجا کر دیا ہے۔ مختلف شخصیتوں
متنوع پہلوؤں پر لکھی گئی ان تحریروں کو دلوی صاحب نے اس خوبصورتی کے ساتھ، ایک
رستہ کے روپ میں پیش کیا ہے کہ اس کتاب کو ایک مستقل تصنیف کی حیثیت دی جا سکتی ہے۔

"نئی تحریریں" کا پہلا مقالہ "اقبال اور بمبئی" ہے، جس میں پروفیسر دلوی نے
ستمبر ۱۹۰۵ء کے ایک خط کے حوالے سے، جو اقبال نے اپنے ایک قریبی دوست،
لوی انشاءاللہ خان کے نام تحریر کیا تھا، بمبئی کے بارے میں اقبال کے تاثرات کا مفصل تذکرہ
ا ہے۔ ڈاکٹر دلوی لکھتے ہیں۔

"انہوں نے (اقبال نے) اس خط کے ذریعے ابتدائے بیسویں صدی
کی بمبئی کی علمی اور تہذیبی زندگی پر روشنی ڈالی ہے۔ یہاں کے رہن سہن
کا نقشہ کھینچا ہے، یہاں کی ارزانی کی کیفیت بیان کی ہے۔ یہاں کے
مسلمانوں کی تعلیمی حیثیت اور علمی سوجھ بوجھ اور اسی طرح پارسیوں کے
طریقۂ زندگی کے مثبت اور منفی پہلوؤں پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔"

"پریم چند کا قیام بمبئی" اس کتاب کا دوسرا مضمون ہے، جس کے مطالعہ سے پتہ چلتا
کہ پریم چند اپنی مالی پریشانیوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کی غرض سے، ایک فلم کمپنی
ایک سال کے کنٹریکٹ پر بمبئی گئے تھے۔ کمپنی کے بند ہو جانے کی وجہ سے انہیں تین ماہ
ہی اپنے وطن واپس ہو جانا پڑا۔ ویسے بمبئی کے تجارتی ماحول اور فلم کمپنی کی چرکا چوند
وہ ہمیشہ ناخوش ہی رہے۔ پریم چند فلموں میں اپنی مقصدی کہانیوں سے، سماج کی اصلاح
چاہتے تھے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"سینما میں اصلاح کی توقع کرنا بیکار ہے۔ یہ صنعت بھی اسی طرح سرمایہ داروں
کے ہاتھ میں ہے جیسے شراب فروشی۔"

ایک اور خط میں لکھتے ہیں۔

"ایک ادبی انسان کے لیے سینما میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ میں اس لائین میں اس لئے آیا کہ مجھے اس میں مالی نقطہ نظر سے آزاد ہونے کے کچھ امکان نظر آئے، لیکن اب میں دیکھتا ہوں کہ میں دھوکے میں تھا اور اب میں پھر ادب کی طرف لوٹ رہا ہوں۔"

پروفیسر دلوی نے "پریم چند کے احباب کے بیانات اور مکاتیب پریم چند کے تانے بانے سے" ان کے قیام بمبئی کا ایک خوبصورت اور پُراز معلومات خاکہ تحقیقی انداز میں مرتب کیا ہے۔ اور بعض نئے زاویوں سے پریم چند کی شخصیت اور واقعات حیات پر روشنی ڈالی ہے۔

سکندر علی وجد نہ صرف اورنگ آباد اور مہاراشٹر کے ایک قدآور سخن ور ہیں بل کہ اردو کے ممتاز کلاسیکی شاعروں میں بھی شمار کیے جاتے ہیں۔ وہ بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں، لیکن غزل گوئی کے میدان میں بھی ان کی اہمیت مسلّم ہے۔ وجد کی نظموں "اجنتا" "ایلورا" کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ نظمیں انہوں نے پندرہ سال کے عرصے میں مکمل کی ہیں۔ ان نظموں میں واقعی شاعر کے خونِ جگر کی آمیزش دیکھی جاسکتی ہے۔

اقبال اپنی مشہور نظم "مسجد قرطبہ" میں کہتے ہیں ؎

رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

سکندر علی وجد کی نظمیں "اجنتا" اور "ایلورا" "معجزۂ فن" کے نقطہ نظر سے بے مثال اور شاہکار تخلیقات ہیں۔ پروفیسر دلوی نے "سکندر علی وجد۔ فنونِ لطیفہ کا شاعر" میں وجد کے حالاتِ زندگی کا اجمالی جائزہ لیتے ہوئے ان کی مشہور زمانہ منظومات "اجنتا"۔ "ایلورہ"۔ "رقاصہ" اور "تاج محل" کا اس دور کے تاریخی، فنی، مذہبی اور ثقافتی پس منظر میں تجزیہ کیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ وجد کی نظم نگاری اور غزل گوئی پر بھی نئے مباحث ابھارے ہیں۔

بمبئی اور مہاراشٹر سے متعلق شخصیات میں ڈاکٹر دلوی نے پروفیسر نجیب اشرف ندوی کی شخصیت و کردار اور اُن کی زندگی کے مختلف ادوار کے بارے میں دو معرکتہ الآرا مضامین تحریر کر کے گویا حقِ شاگردی ادا کر دیا ہے۔ پروفیسر ندوی کے بارے میں اگرچہ اور کتابیں اور مضامین بھی لکھے گئے ہیں، لیکن دلوی صاحب کے مضامین میں وہ ایک جیتی جاگتی اور ہنستی بولتی شخصیت کے روپ میں سامنے آتے ہیں۔ ان مضامین میں پروفیسر دلوی نے نہ صرف ندوی صاحب کے واقعاتِ حیات، شخصیت و کردار کا بھرپور جائزہ لیا ہے بلکہ ان کی علمی و ادبی اور تحقیقی زندگی کے تین اہم ادوار (۱- دارالمصنفین کے فیلو ۲- اسمٰعیل یوسف کالج کے پروفیسر ۳- انجمن اسلام کے ڈائرکٹر) پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے۔ دلوی صاحب کے ان مضامین سے یہ تاثر ابھرتا ہے کہ پروفیسر نجیب اشرف ندوی کی بدولت بمبئی کے علمی اور ادبی وقار میں اضافہ ہوا ہے اور ندوی صاحب کے تذکرہ کے بغیر بمبئی کی علمی ادبی اور تحقیقی شخصیات کے بارے میں لکھی جانے والی کوئی بھی تصنیف نامکمل اور ادھوری رہے گی۔

مہاراشٹری ادب کے عظیم مصنفوں میں وشنو سکھارام کھانڈیکر کا نام اہمیت کا حامل ہے وہ مراٹھی ادب کے ایک بلند پایہ افسانہ نگار، ناول نویس، انشائیہ نگار اور نقاد بھی تھے۔ انھوں نے متذکرہ نثری اصناف میں کوئی ۶۵ کتابیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ ان کی ایک تصنیف کو "گیان پیٹھ" انعام سے بھی نوازا گیا ہے۔ پروفیسر عبدالستار دلوی نے اپنے مضمون "وشنو سکھارام کھانڈیکر" میں سیدھے سادے اور دل نشین انداز میں، اُردو والوں کو، مراٹھی کے ایک بلند پایہ مصنف سے متعارف کروانے کی پرخلوص کوشش کی ہے۔ موجودہ دور میں ایسے مضامین کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ مختلف ہندوستانی زبانوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے اور ایک دوسرے کی ادبی تخلیقات سے استفادہ کرنے کے سلسلہ میں یہ ایک اہم مضمون ہے۔ ڈاکٹر دلوی نے علاقائی ادب کے ایک عظیم فن کار کی ادبی خدمات کو اہلِ اردو سے متعارف کر کے دیگر علاقائی زبانوں کے شاعروں اور ادیبوں اور

ان کی تخلیقات سے واقفیت حاصل کرنے کی شروعات کی ہے۔

"شبلی مکتوب نگار کی حیثیت سے"، "نئی تحریریں" کا ایک اہم مضمون ہے، جس میں دلوی صاحب اردو مکتوب نگاری پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے غالب کے بعد شبلی کو اردو کا سب سے اہم مکتوب نگار قرار دیتے ہیں، جس کے خطوط میں مکتوب نگار کی شخصیت کے واضح نقوش کے علاوہ خیالات و جذبات کی لطافت اور اسلوب کی رنگا رنگی ملتی ہے۔ مولانا شبلی نہ صرف ایک عالم دین، مورخ، شاعر اور انشاپرداز کی حیثیت سے اعلیٰ رتبہ پر فائز تھے بلکہ ایک ماہر تعلیم اور مکتوب نگار کی حیثیت سے بھی اہمیت کے حامل تھے۔ شبلی کی عالمانہ شخصیت اور تنقیدی بصیرت ان کی تمام تحریروں میں نمایاں ہے لیکن۔ ان کی طبیعت کی شوخی، زندہ دلی اور بذلہ سنجی کی جھلک صرف اور صرف ان کے خطوط میں دیکھی جا سکتی ہے۔ ڈاکٹر عبدالستار دلوی نے عطیہ فیضی کے نام شبلی کے مکاتیب کا حوالہ دیتے ہوئے، ان کی شخصیت کی رنگین مزاجی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ان کے خیال میں شبلی کے یہ مکاتیب، اردو خطوط نگاری کی تاریخ میں نمایاں حیثیت کے حامل ہیں۔ کیوں کہ ان خطوط سے شبلی کی عطیہ بیگم سے رسم و راہ کا پتہ چلتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ شبلی کی شخصیت کے تمام پہلو ان مکاتیب میں روشن ہو جاتے ہیں۔

"مولوی عبدالحق نفسیاتی مطالعہ" پروفیسر دلوی کا ایک جامع اور بھرپور مقالہ ہے جس میں بابائے اردو کی شخصیت، حیات اور ان کی علمی ادبی اور تحقیقی زندگی کے بعض نئے گوشے پہلی بار سامنے آتے ہیں اگرچہ مولوی صاحب پر متعدد کتابیں اور بیسیوں مقالے تحریر کئے گئے ہیں۔ لیکن دلوی صاحب کے پیش نظر مقالہ میں "مولوی عبدالحق" ان کے واقعات حیات شخصیت و کردار، اور مختلف ادوار میں ان کی علمی، ادبی اور تحقیقی سرگرمیوں کا تفصیلی جائزہ ملتا ہے۔ پروفیسر دلوی نے 'دکنی ادب' سے متعلق' مولوی صاحب کی تصانیف اور مضامین کو، ان کا سب سے اہم تحقیقی کارنامہ قرار دیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

" اردو ادب میں مولوی عبدالحق صاحب مختلف النوع شخصیت کے مالک ہیں اور

ادبی دنیا ان سے ایک مورخ، محقق، نقاد، لغت نویس، مترجم اور خاکہ نگار کی حیثیت سے واقف ہے تحقیق کے میدان میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے قدیم دکنی ادب کو منظر عام پر لاکر اسے عوام سے روشناس کرایا اور اس کی عمر کو صدیوں آگے بڑھایا۔"

پروفیسر دلوی نے مولوی عبدالحق پر سرسید اور حالی کے اثرات کی نشاندہی کرتے ہوئے ان کی تنقید نگاری، مقالہ نگاری اور تبصرہ نویسی اور خاکہ نگاری کی خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے۔

"ہندوستان کا لسانی مسئلہ اور گاندھی جی" اور "اردو کا ہندوستانی رجحان" پروفیسر دلوی کے دو فکر انگیز اور بصیرت افروز مقالے ہیں۔ اول لذکر مقالے میں ڈاکٹر دلوی نے ہندوستان میں اردو اور ہندی زبان کے تاریخی اور لسانی پس منظر پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ وہ گاندھی جی کے نظریے سے اتفاق کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"گاندھی جی قومی زبان کی حیثیت سے ہندوستانی کو اپنا کر درحقیقت ہندی اور اردو دونوں کو اپنا جائز مقام دلانا چاہتے تھے۔ وہ ان دونوں اسالیب کو اتحاد اور میل کی تمام خصوصیات سے مملو دیکھنا چاہتے تھے۔ جس کے میل سے ایک انسان عظیم انسان اور ایک تہذیب عظیم تہذیب اور ایک زبان عظیم زبان بن جاتی ہے اور اس لحاظ سے وہ ہندی اور اردو کو ہندوستانی کی پالنے والی بھاشائیں سمجھتے تھے۔"

اردو کا ہندوستانی رجحان" میں پروفیسر دلوی نے اردو شعر وادب میں ہندوستانی روایات اور رجحانات کی نشاندہی کی ہے اور اسے اردو شعر وادب کا ایک اہم اور نمایاں وصف قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ "اس کی سادگی اور اصلیت" بھاشا سے آتی ہے اس میں بارہ ماسے ہیں گیت ہیں، دوہے ہیں اور ان سب سے بڑھ کر ہندوستانی مزاج اور فکر کی آمیزش ہے۔ آگے چل کر وہ لکھتے ہیں۔" اردو میں لسانی اعتبار سے

"ہندوستانیت" کا رجحان دکنی کے دور دوم سے شروع ہوتا ہے جب کہ اورنگ آباد اور اس کے نواح میں دکنی اردو اور شمالی اردو کے ملاپ سے زبان کا ایک ملا جلا رنگ پیدا ہو رہا تھا۔ راقم السطور کے خیال میں متذکرہ بالا سطور میں پروفیسر دلوی نے دکنی اردو کے دور دوم میں جس "ہندوستانیت" کی ابتدا کا تذکرہ کیا ہے، زبان و ادب کے نقطۂ نظر سے وہ صرف ایک تسلسل ہے، دکنی اردو کے دور اول کی شاعری کا جس کے واضح نقوش وجہی، محمد قلی، غواصی، نصرتی، ہاشمی، شوقی اور شاہی کے کلام میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

تحقیقی نقطۂ نظر سے "نئی تحریریں" کا سب سے اہم مقالہ "شاہ تراب چشتی : نظیر اکبر آبادی کا پیش رو" ہے۔ جس میں پروفیسر دلوی نے اردو کے دو بلند مرتبہ عوامی شاعروں شاہ تراب چشتی اور نظیر اکبر آبادی کے کلام کا تحقیقی، تنقیدی اور تقابلی مطالعہ کر کے اردو کے عوامی ادب کی اہمیت کو نمایاں کیا ہے۔ اس مقالہ کو بجا طور پر ڈاکٹر دلوی کا تحقیقی کارنامہ کہا جا سکتا ہے۔ شاہ تراب چشتی اور نظیر اکبر آبادی دونوں اردو کے بڑے نظم نگار اور صاحب دیوان شاعر تھے۔ دونوں کے یہاں مضامین و موضوعات اور انداز بیان میں مماثلت اور اشتراک کے حیرت انگیز نمونے ملتے ہیں۔ شاہ تراب نے اپنے خیالات و افکار کے اظہار و ترسیل کے لیے ترجیع بند کی ہیئت کو پسند کیا جب کہ نظیر نے زیادہ تر نظمیں مخمس کی ہیئت میں لکھی ہیں۔ ڈاکٹر دلوی نے تراب اور نظیر کے کلام کا تنقیدی اور تقابلی جائزہ لیتے ہوئے دونوں کے مزاج و کردار، ان کی وسیع المشربی، انسان دوستی اور بھائی چارگی کے جذبات کی ترجمانی کو ان کے کلام کا نمایاں وصف قرار دیا ہے۔

(مطبوعہ سب رس فروری ۱۹۹۲ء حیدر آباد)

نظیر اکبر آبادی کے واقعاتِ حیات

نظیر اکبر آبادی کے حالاتِ زندگی اور اُن کی شخصیت سے متعلق مواد حاصل کرنے کے ذرائع محدود ہیں۔ مختلف تذکرہ نگاروں نے ان کے حالاتِ زندگی کے بارے میں کچھ اچٹتے ہوئے اشارے کئے ہیں[1] لیکن نظیر کے ایک شاگرد حکیم میر قطب الدین باطن مرتب تذکرہ گلستانِ بے خزاں نے اپنے استاد کا ذکر نہایت تفصیل سے کیا ہے[2] نظیر کے ممتاز سوانح نگار پروفیسر عبدالغفور شہباز نے اپنی تحقیق و جستجو کے ذریعے شاعرانہ اسلوب اور پرستارانہ انداز میں ان کے مفصل حالاتِ زندگی قلمبند کر کے نظیر کو بے نظیر بنا دیا ہے[3]

---

[1] نظیر کا ذکر درج ذیل تذکروں میں ملتا ہے:
۱۔ "عمدۂ منتخبہ" از اعظم الدولہ سرور ۲۔ "مجموعۂ نغزہ" از قدرت اللہ قاسم ۳۔ "تذکرۂ بے جگر" (قلمی) از خیراتی "لعل بے جگر" ۴۔ "طبقات سخن" از شیخ غلام محی الدین عشق و مبتلا میرٹھی ۵۔ "گلشنِ بے خار" از مصطفی خاں شیفتہ ۶۔ "گلدستۂ ناز نیناں" از کریم الدین ۷۔ "خوش معرکۂ زیبا" از سعادت خاں ناصر ۸۔ "طبقات الشعرائے ہند" از کریم الدین و فیلن ۹۔ "گلشنِ ہمیشہ بہار" از مولوی عبدالعلیم نصراللہ خاں۔ ۱۰۔ "گلستانِ سخن" از قادر بخش خاں ناصر ۱۱۔ "سخن الشعرا" از عبدالغفور نساخ۔ ۱۲۔ "شمیم سخن" از عبدالحی صفا بدایونی۔ ۱۳۔ "آبِ حیات" از محمد حسین آزاد۔

[2] "گلستانِ بے خزاں" میں نظیر کا تذکرہ سارے تذکرے میں سب سے زیادہ یعنی بیس صفحات میں کیا گیا ہے۔

[3] پروفیسر شہباز کی کتاب "زندگانیِ بے نظیر" تقریباً چار سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے جس کا پہلا ایڈیشن ۱۸۹۶ء میں حیدر آباد سے شائع ہوا تھا۔ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن ترقی اردو بیورو دہلی کی جانب سے ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا۔

ولی محمد نظیرؔ دہلی میں پیدا ہوئے[1] ان کے والد کا نام محمد فاروق تھا وہ معمولی پڑھے لکھے آدمی تھے[2] ان کے والد یعنی نظیر کے دادا عظیم آباد کے کسی نواب کے مصاحب تھے۔ نظیر کی والدہ نواب سلطان خان قلعہ دار آگرہ کی دختر تھیں۔ محمد فاروق کو بارہ اولادیں ہوئیں لیکن ایک بھی زندہ نہ بچی۔ ان کی بیوی ا[illegible] خوش دامن مختلف درویشوں، فقیروں اور مجذوبوں کے آستانوں پر اولاد بخشی کی نذریں پیش کرنے لگیں۔ محمد فاروق بھی اہل اللہ کی آستانہ بوسی اور دعا و تعویذ پر اعتقاد رکھتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک درویش صفت بزرگ نے انہیں پانچ پھول عنایت کر کے اور کہا کہ انہیں سونگھ کر دریا میں ڈال دو اور جو کیفیت ان پھولوں کی ہو بیان کرو۔ محمد فاروق نے جذباتِ عقیدت کے ساتھ شاہ صاحب کی ہدایت کے مطابق پھولوں کو سونگھ کر جمنا میں ڈال دیا۔ ان پھولوں میں سے ایک سیدھا اور باقی اُلٹے پانی کی سطح پر تیرتے رہے۔ نظیر کے والد محمد فاروق نے جب یہ ماجرا درویش سے بیان کیا تو انھوں نے خوشی کی بشارت دی اور کہا کہ تیرا ایک لڑکا زندہ رہے گا جو اپنی ذہانت اور قابلیت سے تیرا نام روشن کرے گا۔[3] غرض منّتوں مرادوں اور دُعاؤں کے بعد نظیر پیدا ہوئے۔ وہ گویا محمد فاروق کی تیرہویں اولاد تھے۔ بڑے لاڈ پیار سے پلے بڑھے۔ چوں کہ ان کے ماں باپ کی کئی اولادیں ضائع ہو چکی تھیں۔ اس لیے نظرِ بد سے بچانے

---

[1] ڈاکٹر اطہر راہی نے "کلیاتِ نظیر" مطبوعہ رام نارائن بینی مادھو الہ آباد ۱۹۷۶ء میں لکھا ہے۔ "ان کی جائے پیدائش کئی تذکرہ نگاروں نے دلّی لکھی ... لیکن ایک تذکرہ نگار نے آگرہ اور آگرے کے ایک تاج محل صاحب نے عظیم آباد کو جائے پیدائش بتایا ہے۔" ص۴

[2] پروفیسر شہباز "زندگانیِ بے نظیر" صفحہ ۱۲

[3] "زندگانیِ بے نظیر" ص۱۴ مولوی انتظام اللہ شہابی نے اپنے مضمون "نظیر کے مختصر سوانح" مطبوعہ "نگار" (نظیر نمبر) میں نظیر کی پیدائش کا ذکر اس طرح کیا ہے:

"سید محمد فاروق کے کوئی اولاد عرصے تک نہ ہوئی۔ ان کی بیوی فقرا کی آستانہ بوسی میں لگی رہیں مگر کوئی پھل نہ ملا۔ اتفاقیہ ایک دن ان کے مکان پر ایک شاہ صاحب آ گئے۔ اُن کی مدارات میں کوئی کمی نہ کی اور اپنا مدعا عرض کیا اور دُعا کی طالب ہوئیں۔ بزرگ نے ارشاد فرمایا، پھولوں کا دونہ روزانہ ایک ہفتہ تک جمنا میں چھوڑ دو۔ خدا نے چاہا تو جیتا جاگتا بیٹا پاؤگی اور اس بچّے کی خوشبو دُور دُور تک مہکے گی۔"

کے لیے نظیر کی ناک اور کان چھید دیے گئے[1]، چوٹی رکھی گئی اور ان کی شکل بچیوں جیسی بنا دی گئی۔
نظیر کی تاریخ پیدائش کا قطعی طور پر تعین کرنا مشکل ہے۔ تاہم اس قدر ضرور کہا جا سکتا ہے کہ وہ محمد شاہ ثانی کے دور میں نادر شاہ کے حملے (۱۷۳۹ء) کے آس پاس کسی سال پیدا ہوئے ہوں گے۔ آسی لکھنوی نے اپنے مرتبہ "کلیاتِ نظیر" میں ان کا سنۂ پیدائش ۱۱۴۸ھ م ۱۷۳۵ء درج کیا ہے۔ پروفیسر شہباز نے "زندگانیٔ بے نظیر" میں بھی نظیر کا سنۂ ولادت یہی لکھا ہے۔ بعد کو فرحت اللہ بیگ نے "دیوانِ نظیر" میں، مخمور اکبرآبادی نے "روحِ نظیر" میں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے "نظیر ــ ان کا عہد اور شاعری" میں ڈاکٹر سلیم جعفر نے "گلزارِ نظیر" میں اور ڈاکٹر محمد حسن نے "نظیر اکبرآبادی" میں اسی روایت کی پیروی کرتے ہوئے اُن کی تاریخ پیدائش ۱۷۳۵ء لکھی ہے۔ البتہ انتظام اللہ شہابی نے اپنے مضمون "نظیر کے مختصر سوانح" میں ان کا سنۂ ولادت ۱۱۴۸ھ مطابق ۱۷۳۶ء درج کیا ہے۔[2]
نظیر کی ابتدائی زندگی پریشان حالی اور عسرت میں بسر ہوئی۔ وہ ابھی چار سال ہی کے تھے کہ دہلی جیسے "عالم میں انتخاب" شہر کو پے در پے مصیبتوں اور تباہیوں سے دوچار ہونا پڑا۔ پہلے تو نادر شاہ نے یہاں لوٹ کھسوٹ اور قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا، پھر احمد شاہ ابدالی کی نظرِ بد اس عروس البلاد پر پڑی جس نے ۱۷۴۸ء، ۱۷۵۱ء اور ۱۷۵۶ء میں تین بار دہلی پر حملہ کر کے اس پُر امن شہر کو اجڑے ہوئے دیار میں تبدیل کر دیا۔ اس تباہی اور بربادی کی وجہ سے اہلِ دہلی کو نہ صرف تباہیوں اور بربادیوں کا سامنا کرنا پڑا بلکہ مفلسی اور فاقہ کشی کے دن بھی دیکھنے پڑے۔ ان حالات میں لوگ اپنے وطن کو چھوڑنے پر مجبور ہو گئے[3] اور جسے جہاں گوشۂ عافیت نظر آیا، نکل کھڑا ہوا۔ نظیر بھی بائیس تئیس سال

---

[1] "زندگانیٔ بے نظیر" ص ۱۴

[2] "نظیر نامہ" مرتبہ شمس الحق عثمانی ص ۲۶

[3] دہلی کی تباہی و بربادی اور یہاں کے اہلِ کمال کی زبوں حالی کا اندازہ میر کے ان اشعار سے لگایا جا سکتا ہے:
(باقی اگلے صفحہ پر)

کی عمر میں اپنی ماں اور نانی کے ہمراہ دہلی کو الوداع کہہ کر اکبرآباد (آگرہ) چلے آئے۔ نوری دروازے کے قریب مکان لے کر رہنے لگے۔ آخر عمر تک اسی مکان میں مقیم رہے اور یہیں سپردِ خاک کئے گئے۔

نظیر نے ادھیڑ عمر میں شادی کی۔ ان کی اہلیہ کا نام تہورالنسا بیگم تھا۔ وہ دہلی کے فوجی سالار محمد رحمٰن خاں کی دختر۔ اور عبدالرحمٰن خاں چغتائی کی نواسی تھیں۔ تہورالنسا سے نظیر کو ایک لڑکا گلزار علی اور ایک لڑکی امامی بیگم پیدا ہوئی [۱] نظیر کو اردو یا ہندوستانی کے علاوہ فارسی زبان پر بھی عبور حاصل تھا۔ اس کے علاوہ وہ تقریباً نصف درجن زبانوں سے واقف تھے [۳] ان میں عربی، سنسکرت، پنجابی، برج بھاشا وغیرہ شامل ہیں۔[۴]

شاعری کے علاوہ نظیر نے اور بھی کتابیں تصنیف کیں۔ نثر میں ان کی کتابوں کے نام ہیں:
"انشائے نظیر" "قدرِ متین"، فہم قریں، بزمِ عیش، رعنائے زیبا، "حسنِ بازار اور طرزِ تقریر وغیرہ۔ شاعری میں ضخیم کلیات کے علاوہ انہوں نے مثنوی حسن و عشق اور ایک کتاب خالق باری، کے

دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انہیں	تھا کل تلک دماغ جنہیں تخت و تاج کا
شہاں کہ کحلِ جواہر تھی خاکِ پا جن کی	انہیں کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھیں
تو ہے بے چارہ گدا میر ترا کیا مذکور	خاک میں مل گئے یاں صاحبِ افسر کتنے
دِلی کے نہ تھے کوچے اوراقِ مصوّر تھے	جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی
آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت	یاں راہ میں اسباب لٹا ہر سفری کا

[۱] امامی بیگم وہی خاتون ہیں جن کی مدد سے پروفیسر شہباز نے نظیر کے حالاتِ زندگی مرتب کئے ہیں۔
[۳] پروفیسر شہباز نے لکھا ہے کہ نظیر سات زبانیں (اردو، فارسی، عربی، سنسکرت، برج بھاشا، پنجابی اور مارواڑی) جانتے تھے۔
[۴] نظیر خود اپنی لیاقت کے تعلق سے انکسار سے کہتے ہیں۔

فہم نہ تھا علم سے، کچھ بھی عربی کے اُسے
فارسی میں ہاں مگر سمجھے تھا کچھ این و آں

انداز میں بھی لکھی ہے۔

پروفیسر شہباز، میرنوازش بیگ کے حوالے سے نظیر کے فارسی دیوان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ: "میرنوازش بیگ نے تو یہ بھی کہا تھا کہ فقط اردو ہی نہیں ایک دیوان ان کا فارسی میں بھی ہے۔ میں نے ان سے طلب کیا تو انہوں نے فرمایا کہ دونوں دیوان میرے ایک عزیز گوالیار لے گئے ہیں، وہاں سے منگوا کر حاضر کر دوں گا۔ نہیں معلوم کیا سبب آج تک انہوں نے وعدہ وفا نہیں کیا تھا شاید ان کے وہ گوالیاری عزیز دبا بیٹھے" [۱]

پروفیسر شہباز نے نظیر کی دو ایسی نظموں کا بھی ذکر کیا ہے جو ان کے کلیات میں نہیں ملتیں۔ ان نظموں کا نام "جوگن نامہ" اور "جوگی نامہ" ہیں جو بالترتیب چھیالیس اور انتالیس بندوں پر محیط ہیں۔ [۲]

ایک نظم میں نظیر نے خود اپنا حلیہ، علمی استعداد، پیشہ، قد و قامت اور دیگر مشاغل کے بارے میں روشنی ڈالی ہے [۳] جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ میانہ قد تھے۔ رنگ گندمی تھا، مونچھیں رکھتے تھے۔ لیکن تھوڑی کے بال صاف، کانوں پر پٹے، لمبی لمبی زلفیں، ابروؤں کے درمیان ماتھے پر مسّے کے طور پر ایک تل تھا۔ وہ خوش نویس بھی تھے۔ ہمیشہ شعر و غزل کے شوق میں لگے رہتے تھے۔ معلّمی ان کا پیشہ تھا اور اللہ کے فضل سے وہ عمر بھر بے فکر اور فارغ البالی کی زندگی گزارتے رہے ہے۔

نظم دیکھئے:

کہتے ہیں جس کو نظیر سنیئے ٹک اس کا بیاں   تھا وہ معلم غریب بزدل و ترسندہ جاں

۱-۲ "زندگانی بے نظیر" ص ۲۴۳

۳ پروفیسر شہباز نے "زندگانی بے نظیر" میں نظیر کا حلیہ اس طرح سے بیان کیا ہے۔

"آنکھیں چھوٹی، سر اوسط درجے کا، ناک بلند، تھوڑی اعتدال کی، پیشانی چوڑی، اور اونچی، سینہ بہت چوڑا، رنگ گندم گوں، قد بہت پست اور نہ بہت طویل متوسط درجے کا، ص ۱۲-۱۷

فضل سے اللہ کے اس کو دیا عمر بھر ۔۔۔ عزت و حرمت کے ساتھ پارچہ و آب و ناں
فہم نہ تھا علم سے کچھ بھی عربی کے اسے ۔۔۔ فارسی میں ہاں مگر سمجھے تھا کچھ این و آں
سست روش، پستہ قد، سانولا ہندی نژاد ۔۔۔ تن بھی کچھ ایسا ہی تھا، قد کے موافق عیاں
ماتھے پہ اک خال تھا، چھوٹا سا مسّے کے طور ۔۔۔ تھا وہ پڑا آن کر، ابروؤں کے درمیان
وضع سبک اس کی تھی تس پہ نہ رکھتا تھا ریش ۔۔۔ مونچھیں تھیں اور کان پر پٹے بھی تھے پنبہ ساں
پیری میں جیسی کہ تھی اس کی دل افسردگی ۔۔۔ ویسی ہی تھی ان دنوں، جن دنوں میں تھا جواں
لکھنے کی یہ طرز تھی کچھ جو لکھے تھا کبھی ۔۔۔ پختگی و خامی کے، اس کا تھا خط درمیاں

نظیر کے لباس کے بارے میں تذکرہ نگار کہتے ہیں کہ وہ چکر دار محمد شاہی پگڑی باندھتے، کرتا سیدھے پردے کا اور انگرکھا نیچی چولی کا پہنتے، پاجامہ ایک برکا ہوتا، جوتی گھتیلی پہنتے تھے ہاتھ میں چاندی کے دستے والی چھڑی استعمال کرتے اور انگلیوں میں فیروزے اور عقیقِ سرخ کی انگوٹھیاں پہنتے۔

نظیر نے معلمی کا پیشہ اختیار کیا تھا اور تمام عمر اسی پیشے سے وابستہ رہے۔ روایتوں کے مطابق وہ شرفائے اکبرآباد کے بچوں کے اتالیق تھے۔ متھرا میں بھی لڑکوں کو پڑھاتے تھے۔ بہاؤ قلعہ دار آگرہ کو اور نواب محمد علی خاں کے بچوں کو بھی درس دیا کرتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ راجہ بلاس رائے کے چھ بچوں، ہر بخش رائے، گربخش رائے، مول چند رائے، من سکھ رائے، بنسی دھر اور شنکر داس کے اتالیق بھی مقرر تھے۔ وہ ایک پُر گو اور قادرالکلام شاعر تھے۔ لیکن کبھی بھی انھوں نے شاعری کو تجارت نہیں بنایا۔ قناعت اور استغنا طبیعت میں داخل تھا۔ اسی لیے کسی بادشاہ، راجہ یا نواب کی مصاحبت قبول نہیں کی۔ نواب واجد علی شاہ نے ان سے لکھنو آنے کی درخواست کی اور رقم بھی بھجوائی لیکن انھوں نے آگرے کو چھوڑنا گوارا نہیں کیا اور رقم واپس

کر دی۔[1] اسی طرح بھرت پور کے راجہ اور حیدر آباد کے نظام نے بھی انہیں طلب کیا تھا لیکن وہ نہیں گئے۔[2]

جوانی میں نظیر بڑے منچلے اور رنگین مزاج تھے۔ پروفیسر شہباز نے "موتی" نام کی ایک رقاصہ سے اُن کے معاشقے کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ نظیر کے دوستوں کا بہت بڑا حلقہ تھا۔ ان کے احباب میں بچے، جوان اور بوڑھے سبھی شامل تھے۔ انہیں بچپن ہی سے ورزش کا شوق تھا۔ داؤ پیچ خوب جانتے تھے۔ کُشتی بھی لڑتے تھے، ہتھیار چلانے میں بھی مہارت تھی، نظیر کو ہر اس کھیل اور فن سے دلچسپی تھی جس میں ان کی تفریح طبع کا سامان میسّر ہو۔ شطرنج، چوپسی، پتنگ بازی، کبوتر بازی اور تیراکی میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتے۔ سیر سپاٹے کے بھی رسیا تھے۔ مختلف تہواروں، عیدوں، جاتراؤں، عرسوں، میلوں ٹھیلوں کا لطف اُٹھایا کرتے تھے۔ وہ رنگ و نسل، مذہب و مِلّت کے امتیازات کو چھوڑ کر ہر انسان کو انسان کی حیثیت سے پیار کرتے تھے۔ بقول ڈاکٹر محمد حسن:

"نظیر کی دنیا بے تکلف انسانوں کی دنیا ہے جس میں آدم کی اولاد اپنی تمام کمزوریوں کے ساتھ موجود ہے۔ انہوں نے زندگی کو تنگ دلی، بے رونق اور سنجیدہ مشغولیت کے بجائے جوش و خروش کا ذریعہ بنا لیا ہے۔ وہ زندگی کو ہر حال میں ہنس کر گزار دینے کے قائل ہیں"۔[3]

جوانی میں مزاج عاشقانہ تھا۔ عمر ڈھلنے کے ساتھ صوفیانہ رنگ غالب آگیا۔[4] ظاہری عبادت میں مشغولیت کم تھی لیکن صوفیہ کی صحبت میں زیادہ تر وقت گزارتے تھے اور صوفیانہ مباحثوں

---

[1] بعض تذکرہ نگاروں نے اس طرح روایت بیان کی ہے کہ واجد علی شاہ کے قاصد کے بے حد اصرار پر انہوں نے لکھنؤ جانے کی ٹھان لی تھی۔ وہ اپنے ٹٹو پر سوار ہو کر روانہ ہوئے جس پر ابھی تک ہنٹر یا کوڑا نہیں مارا گیا تھا۔ جب تک تاج محل نظر آتا رہا وہ آگے بڑھتے رہے اور جب تاج محل آنکھوں سے اوجھل ہو گیا تو وہ رک گئے۔ وطن کی جدائی ان سے برداشت نہ ہو سکی اور لکھنؤ جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ بحوالہ "نظیر اکبر آبادی" مرتبہ محمد حسن ص ۲۳-۲۴۔

[2] سید احتشام حسین "اردو کی کہانی" ص ۶۲

[3] "نظیر اکبر آبادی"، ص ۱۷

[4] نظیر مشہور صوفی مولانا فخر دہلوی کے معتقد تھے۔

میں دلچسپی سے حصہ لیا کرتے تھے۔ تنگ نظری اور تعصب ذرا بھی نہ تھا۔ وہ تمام فرقوں اور مذاہب کے لوگوں کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے اور ان کے رہن سہن، طور طریقوں اور رسم و رواج کا احترام ملحوظ رکھتے۔ طبیعت بذلہ سنج اور شگفتہ پائی تھی۔ بے تکلف دوستوں کی محفلوں میں یہ شگفتگی بہت زیادہ رنگ دکھاتی تھی۔ رواداری، انسانی ہمدردی اور دردمندی بہت زیادہ تھی۔ کسی محتاج کو گھر سے خالی ہاتھ نہ جانے دیتے۔ غریبوں، مسکینوں اور یتیموں کی خبر گیری کرتے تھے۔[1]

نظیر نسلاً قریشی اور مذہباً شیعہ تھے۔ ان کے والد بلاشبہ سنّی تھے لیکن والدہ شیعہ تھیں۔ تبدیلیِ مذہب کے بارے میں کچھ کہنا دشوار ہے۔ ممکن ہے کہ والدہ کی تعلیمات کے زیرِ اثر شیعہ بن گئے ہوں۔ ان کا ذہن تفرقہ بازیوں سے مبرّا تھا۔ تنگ نظری نام کو نہیں تھی۔ شیعہ عقیدے سے متعلق ہوتے ہوئے بھی وہ صوفی منش اور وحدت الوجود کے قائل تھے۔ کہا جاتا ہے کہ نظیر مشہور صوفی مولانا فخر الدین دہلوی سے خاص عقیدت رکھتے تھے۔[2] نظیر نے تقریباً سو سال کی عمر پائی۔ آخر عمر میں مفلوج ہو گئے تھے جس کی وجہ سے زیادہ تر وقت گھر ہی پر گزرتا تھا۔ جان پہچان کے لوگ عزیز و اقارب اور شاگرد ملاقات کے لیے انہیں کے پاس چلے آتے تھے۔ فالج کے حملے کے تین سال بعد انہوں نے انتقال کیا۔ درج ذیل قطعات سے اُن کی تاریخِ وفات ۱۲۴۶ھ مطابق ۱۸۳۰ء نکلتی ہے۔ پہلا قطعہ نظیر کے صاحب زادے خلیفہ گلزار علی اسیر کا ہے اور دوسرا ان کے شاگردِ رشید حکیم قطب الدین باطن کا:

چہ خوش در حلقش آورد فکرِ طبع تاریخ	نظیر اکبر آبادی چوں زیں دنیائے ابتر شد
نظامِ نظم باہم درہم و برہم شدہ یکسر	مخمس بے سر و پا، بیت بیدل، فرد بے سر شد[3]

۱۲۴۶ھ

---

[1] پروفیسر شہباز "زندگانیِ بے نظیر" [2] ڈاکٹر محمد حسن "نظیر اکبر آبادی" ص ۲۴

[3] ڈاکٹر محمد حسن نے اپنی کتاب "نظیر اکبر آبادی" میں نظیر کی تاریخ وفات کے اس قطعے کو ان کے مشہور شاگرد منشی بریج لال سے منسوب کیا ہے۔ (دیکھئے ص ۲۲) فرحت اللہ بیگ نے "دیوانِ نظیر" میں ان کی حتمی تاریخ وفات ۲۶ صفر ۱۲۴۶ھ یکم اگست ۱۸۳۰ء قرار دی ہے اور انتظام اللہ شہابی نے ۲۶ صفر ۱۲۴۶ھ ۱۶ اگست ۱۸۳۰ء بتائی ہے۔

(۲)

ہزار حیف زباطن گزشت استادم | کہ بے نظیر جہاں و نظیر علم آموز
دروازہ پہ چہل و شش بود چوں سنہ ہجری | گزاشت نظم جہاں و جہاں الم آموز
سن وصال طبیعت با نتظام آورد | سر غزل و رباعی و مطلع و دل سوز

۱۲۴۶ھ

نظیر کی وفات کے بعد، ان کی تدفین اور آخری رسومات کی ادائیگی کا مسئلہ نزاعی ہوگیا تھا۔ کیوں کہ دونوں فرقے سنّی اور شیعہ انہیں اپنا سمجھتے تھے اور ہندو بھی ان سے عقیدت رکھتے تھے۔ سنّیوں اور شیعوں نے اپنے اپنے عقیدے کے مطابق نمازِ جنازہ پڑھی۔ جنازے کی چادر ہندو احباب نے سنبھالے گئے۔

نظیر کے شاگردوں کا حلقہ کافی وسیع تھا۔ حکیم قطب الدین باطن، جنہوں نے شیفتہ کے تذکرے "گلشنِ بے خار" کے جواب میں اپنا تذکرہ "گلستانِ بے خزاں" لکھا تھا، کے علاوہ نظیر کے چند اہم شاگردوں کے نام یہ ہیں۔ راجہ بلونت سنگھ، راجہ بدھ سنگھ صافی، شیخ مداری ضمیر، حکیم محمد مہدی ظاہر، شیخ نبی بخش عاشق، منشی حسین علی خاں ماہ اور بیدار بخش ماہر وغیرہ۔

نظیر کی شہرت کا دار و مدار ان کی شاعری پر ہے۔ سخن سنجی اور سخن فہمی کا ملکہ انہیں قدرت سے ملا تھا۔ کم عمری سے ہی شاعری کا شوق تھا۔ انہوں نے باقاعدہ کسی استاد کے آگے زانوئے ادب تہہ نہیں کیا۔ متعدد نو مشق شعرا ان سے مشورۂ سخن کیا کرتے تھے۔ انہوں نے شاعری میں ایک مختلف اور منفرد راہ نکالی۔ جو اس دور کی شاعری کی عام روایت سے قطعی مختلف تھی۔ نظیر نے اردو شاعری کو نئی وسعتوں سے آشنا کیا اور نئے نئے موضوعات عطا کئے۔ انہوں نے خود کو اردو شاعری کے مروجہ دھارے سے جدا رکھا۔ انہیں مشاعروں میں شرکت کرنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ صحیح معنوں میں ایک عوامی شاعر تھے۔ ہندوستان میں بسنے والے عوام کی زندگی کا انہوں نے بہت قریب سے مطالعہ کیا تھا۔ اپنے مشاہدات اور تجربات زندگی کو انہوں نے عوام کی زبان میں نظموں کی صورت میں پیش کیا ہے۔ نظیر کے کلام میں عام ہندوستان کی جھلکیاں ملتی ہیں۔

اِن کے ضخیم کلیات میں ہولی، دیوالی پر بھی نظمیں ملتی ہیں۔ بسنت اور کرشن جنیتی پر بھی اُن کی بعض نظمیں بظاہر بہت معمولی موضوعات پر لکھی ہوئی ہیں مثلاً روٹی، پیسہ، مفلسی، خوشامد وغیرہ لیکن نظیر نے اِن نظموں میں سیدھے سادے اُسلوب میں بڑی حکیمانہ اور فلسفیانہ باتیں بیان کی ہیں۔ غزل اور مثنوی جیسی مروّجہ اصنافِ سخن سے ہٹ کر نظیر نے نظم کی مختلف ہیئتوں کو اپنے شعری اظہار کا وسیلہ بنایا ہے۔ انھوں نے اُردو نظم کو ایک ایسے دور میں ذریعۂ اظہار بنایا جب کہ تمام اصنافِ سخن پر غزل کی حکمرانی تھی۔ حالی اور آزاد سے بہت پہلے تن تنہا انھوں نے اردو نظم کی روایت کا آغاز کیا تھا۔ نظیر کے کلام میں زندگی کی رنگا رنگی اور حرارت شاعری کے روپ میں سمائی ہوئی ملتی ہے۔ اردو شاعری کی تاریخ میں نظیر اپنے وجود سے خود ایک دبستان اور ایک عہد تھے جو انہیں سے شروع ہو کر انہیں پر ختم ہوتا ہے۔

(مطبوعہ سب رس۔ کراچی۔ ستمبر ۱۹۸۸ء)



اسد اللہ وجہی

(کتابیات)

ملک الشعراء اسد اللہ وجہی، قطب شاہی دور کا ایک عظیم المرتبت شاعر اور باکمال نثر نگار ہے۔ قدیم اردو کے دوسرے شاعروں کی طرح وجہی کے واقعات حیات پر بھی تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ تصانیف وجہی کی داخلی شہادتوں سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ وہ ایک ذی علم خاندان کا چشم و چراغ تھا اور اسے، فارسی، عربی اور دکنی اردو کے علاوہ تلگو، کنڑ اور مراٹھی زبانوں پر بھی عبور حاصل تھا۔[1] وجہی کے فارسی دیوان کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ اس کے آبا و اجداد خراسان کے رہنے والے تھے لیکن اس کی پیدائش دکن میں ہوی۔ دکن سے اس کے دلی لگاؤ اور بے پناہ محبت کا اندازہ درج ذیل اشعار سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

---

[1] ابوالبرکات کریلائی، قطب مشتری کا تنقیدی مطالعہ۔ ۱۹۸۵ء ص ۱۲

دکن سا نہیں ٹھار سنسار میں
پنج فاضلاں کا ہے اس ٹھار میں

دکن ہے نگینہ، انگوٹھی ہے جگ
انگوٹھی کوں حرمت نگینہ ہے لگ

دکن ملک کھن دھن عجب ساج ہے
کہ سب ملک سر ہور دکن تاج ہے

دکن ملک بھوت خاصہ اہے
تلنگانہ اس کا خلاصہ اہے

وجہی ابراہیم قطب شاہ کے دور (۱۵۸۰ء ۔ ۱۵۵۰ء) میں پیدا ہوا۔
محمد قلی قطب شاہ (۱۶۱۱ء ۔ ۱۵۸۰ء) نے اسے اپنے دربار کا ملک الشعرا مقرر کیا اور پھر اس نے محمد قطب شاہ (۱۶۲۶ء ۔ ۱۶۱۱ء) اور سلطان عبداللہ قطب شاہ (۱۶۷۴ء ۔ ۱۶۲۶ء) کا زمانہ بھی دیکھا۔ محمد قطب شاہ کے دور میں اس پر کسی وقت شاہی عتاب نازل ہوا اور اسے مفلسی، کسمپرسی اور فاقہ کشی کے دن بھی دیکھنے پڑے۔ عبداللہ قطب شاہ کے تخت نشین ہونے کے بعد وجہی کی قسمت کا ستارہ دوبارہ چمک اٹھا۔ بادشاہ وقت نے اپنے دربار میں بلا کر اس کی عزت افزائی کی' اور اپنی فن کارانہ صلاحیتوں سے کام لیتے ہوئے کوئی نثری کتاب لکھنے کی فرمائش کی۔ وجہی نے اس موقع کو غنیمت جانا اور اپنی مشہور زمانہ معرکۃ الآرا کتاب "سب رس" تصنیف کی۔

"قطب مشتری"، "سب رس"، "تاج الحقائق" اور ایک فارسی دیوان کے علاوہ وجہی کی چند غزلیں، رباعیاں اور مرثیے بھی دستیاب ہوئے ہیں۔ "خطبات گارساں دتاسی" میں وجہی کی ایک مثنوی "پری رخ وماہ سیما" کا ذکر ملتا ہے جو اب نایاب ہے۔

عبداللہ قطب شاہ کے ملک الشعرا غواصی سے وجہی کے کچھ شاعرانہ معرکے بھی رہے ہیں۔ لیکن اس معاصرانہ چشمک کے باوجود غواصی' وجہی کی عظمت کا معترف ہے اور اس کو اپنا مدمقابل بھی سمجھتا ہے۔

اس دکن کے شاعراں میں تجہ شہنشہ کے نزدیک
ہے غواصی ہور وجہی شاعر حاضر جواب [۲]

---

[۲] ڈاکٹر زور۔ دکنی ادب کی تاریخ۔ یک امپوریم دہلی۔ ۱۹۵۸ء ص ۶۳

شاہ افضل قادری (مصنف "محی الدین نامہ") نے اپنے ایک قصیدے میں عبداللہ قطب شاہ کو مخاطب کر کے وجہی کو "عاقل" "کامل" "گیانی" اور "گن بھر" کے الفاظ سے یاد کیا ہے ؎

تجھ ایسے شاہ کوں ہونا سو وجہی سار کا شاعر
نپٹ عاقل، نپٹ کامل، نپٹ گیانی نپٹ گن بھر[۳]

دبستان گولکنڈہ کے آخری باکمال شاعر طبعی نے اپنی مثنوی "بہرام و گل اندام" میں وجہی کے کمالِ فن کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے ؎

یو وجہی مرے خواب میں آئے کر
سورج نا دمکھ اپنا دکھائے کر
سراسر سنیا جو مری مثنوی
کہیا یات طبعی ہے تیری توی[۴]

وجہی چشتیہ مسلک کا پیرو تھا، جس کا اظہار "سب رس" اور "تاج الحقائق" میں جگہ جگہ ہوا ہے۔ "قطب مشتری" کے مطالعہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وجہی اثنا عشری تھا لیکن "سب رس" کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ وہ سنی العقیدہ تھا[۵]۔ "سب رس" کے ایک قلمی نسخہ کے کاتب کا بیان ہے کہ وجہی کا مزار درگاہ حضرت برہنہ شاہ (چمپا پیٹ حیدرآباد) کے احاطے میں موجود ہے[۶]۔ ڈاکٹر م۔ن۔ سعید نے اپنی کتاب "حیات وجہی" میں لکھا ہے کہ "وجہی کے مزار کی جستجو میں راقم الحروف نے اس درگاہ میں بہت سا وقت صرف کیا۔ حضرت سید برہنہ شاہ کے گنبد کے اردگرد بے شمار قبریں اور مزارات ہیں اور کافی شکستہ حالت میں

۳۔ محمد علی اثر۔ دکنی شاعری۔ تحقیق و تنقید۔ حیدرآباد ۱۹۸۸ء ص ۴۷
۴۔ ڈاکٹر زور۔ دکنی ادب کی تاریخ ص ۸۳ ۵۔ وہاب اشرفی۔ قطب مشتری اور اس کا تنقیدی مطالعہ ص ۲۳
۶۔ سب رس (قلمی)، ادارۂ ادبیات اردو مخطوطہ ۹

ہیں۔ کسی واضح رہنمائی اور کسی قطعی اشارے کے نہ ہونے کی وجہ سے وجہی کے مزار کا پتہ لگانا ممکن نہیں ہوسکا۔"[۲۷]

۱۔ تصانیف وجہی (مرتبہ متون)

اختر، نور السعید (ڈاکٹر) تاج الحقائق۔ علوی بک ڈپو۔ بمبئی۔ ۱۹۷۰ء

جاوید وششٹ (ڈاکٹر)۔ سب رس۔ کوہ نور پریس دہلی۔ ۱۹۷۸ء

حمیرا جلیلی (ڈاکٹر)۔ سب رس کی تنقیدی تدوین۔ اعجاز پریس حیدرآباد۔ ۱۹۸۳ء

حمیرا جلیلی (ڈاکٹر)۔ قطب مشتری۔ ترقی اردو بیورو۔ دہلی

زور۔ محی الدین قادری۔ (ڈاکٹر) تاج الحقائق۔ شمس الاسلام پریس حیدرآباد ۱۹۳۶ء

سری رام شرما۔ سب رس (ہندی زبان میں)۔ دکنی پرکاش سمیتی حیدرآباد ۱۹۵۵ء

شمیم انہونوی۔ سب رس۔ مکتبۂ کلیاں لکھنؤ ۱۹۶۲ء

طیب انصاری (ڈاکٹر)۔ قطب مشتری۔ مکتبہ رفاہ عام۔ گلبرگہ ۱۹۶۰ء

عبدالحق مولوی (ڈاکٹر) سب رس۔ انجمن ترقی اردو دہلی۔ ۱۹۳۸ء

عبداللہ سید (ڈاکٹر) سب رس۔ لاہور اکیڈمی لاہور ۱۹۶۲ء

وہاب اشرف (ڈاکٹر) قطب مشتری اور اس کا تنقیدی جائزہ دینا پستک بھون پٹنہ ۱۹۷۷ء

۲۔ وجہی اور اس کے فن سے متعلق کتابیں

آصفیہ بیگم سب رس کے حروف (حرفی مطالعہ)۔ ترقی اردو بیورو۔ دہلی ۱۹۹۱ء

ابو البرکات کربلائی۔ قطب مشتری کا تنقیدی مطالعہ۔ نصرت پبلشرز لکھنؤ ۱۹۸۵ء

اختر۔ احسان الحق۔ سب رس کا تنقیدی جائزہ نصرت پبلشرز۔ لکھنو۔ تاریخ اشاعت ندارد

انیس الحق۔ قاضی۔ سب رس جدید اردو میں۔ شاندار پریس گورکھپور۔ ۱۹۸۲ء

جاوید وششٹ (ڈاکٹر)۔ وجہی کے اشاریے۔ بک سروس۔ دہلی۔ ۱۹۷۳ء

جاوید وششٹ (ڈاکٹر) ملا وجہی۔ ساہتیہ اکیڈمی۔ دہلی۔ ۱۹۸۴ء

---

[۲۷] م۔ن۔ سعید "حیات وجہی" ص ۱۴۸

فیعہ شبنم عابدی (ڈاکٹر) ۔ وجہی اور انشائیہ ۔ دہلی ۔ ۱۹۸۸ء
سعید ۔ م ۔ ن ۔ (ڈاکٹر) ۔ حیات وجہی ۔ موڈرن پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۹۰ء
سہیل بخاری (ڈاکٹر) ۔ سب رس پر ایک نظر ۔ صنم کدہ پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۷۲ء
سیال، محمد حیات خاں ۔ احوال و نقد وجہی ۔ نذر سنز لاہور ۱۹۶۱ء
بوم صادق (ڈاکٹر) دکنی غالب ملا وجہی ۔ میسور ادبی سرکل میسور ۱۹۷۲ء
منظر اعظمی (ڈاکٹر) سب رس کا تنقیدی مطالعہ ۔ انجمن ترقی اردو دہلی ۱۹۷۵ء
ہاب اشرفی (ڈاکٹر) قطب مشتری اور اس کا تنقیدی جائزہ ۔ پٹنہ ۱۹۷۷ء

۲۔ وجہی اور اس کے فن سے متعلق متفرق مضامین (کتابوں میں)

ز ۔ محمد علی (ڈاکٹر) وجہی کی غزلیں "دکنی شاعری تحقیق و تنقید" ۔ حیدرآباد ۱۹۸۸ء
ز ۔ محمد علی (ڈاکٹر) وجہی از ڈاکٹر جمیل جالبی "دبستان گولکنڈہ ادب اور کلچر"
الیاس ٹریڈرس حیدرآباد ۱۹۸۲ء
" " اسداللہ وجہی ۔ "دکنی غزل کی نشو و نما" حیدرآباد ۱۹۸۶ء
عتشام حسین ۔ قطب مشتری کی لسانی خصوصیات ۔ "ذوق ادب اور شعور" ۔
ادارہ فروغ اردو لکھنو ۱۹۵۵ء
ختر حسن ۔ وجہی کے متعلق نئی دریافت ۔ "نقد و نظر" ۔ حیدرآباد ۔ ۱۹۸۴ء
ختر ۔ نور السعید (ڈاکٹر) قدیم اردو کا پہلا انشائیہ نگار ۔ وجہی "نقوش و کمن" بمبئی ۱۹۷۲ء
بر الدین صدیقی ۔ محمد ۔ وجہی ۔ "بجھتے چراغ" نیشنل بک ڈپو حیدرآباد ۱۹۷۵ء
ین ۔ گیان چند (ڈاکٹر) سب رس ۔ "اردو کی نثری داستانیں" انجمن ترقی اردو کراچی ۱۹۶۹ء
مان راشید (ڈاکٹر) قطب مشتری "اردو کی تین مثنویاں" چمن بک ڈپو دہلی ۱۹۶۱ء
" " قطب مشتری ایک مطالعہ "دکنی اردو" لیبل لیتھو پریس بمبئی ۱۹۸۷ء
فیعہ سلطانہ (ڈاکٹر) ۔ سب رس ۔ "اردو نثر کا آغاز و ارتقا" ۔ حیدرآباد ۔ تاریخ اشاعت ندارد ۔

ساحل احمد۔ (ڈاکٹر) ۔"اردو کی چند مشہور کتابیں" سب رس از ڈاکٹر مغنی تبسم الہ باد ۱۹۸۶ء

سلام سندیلوی (ڈاکٹر) ۔ "مطالعہ و مشاہدہ" فن رمزیہ نگاری اور سب رس لکھنؤ ۱۹۸۵ء

سہیل بخاری (ڈاکٹر) ۔ "اردو داستان" سب رس مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد ۱۹۸۷ء

صدیقی۔ مبشر علی۔ ادبی مقالات ۔اردو نثر کی ایک قدیم کتاب سب رس۔ دہلی ۱۹۶۰ء

طیب انصاری (ڈاکٹر) " ادراک معنی " سب رس ولا اکیڈمی حیدر آباد ۔ ۱۹۷۳ء

عارف۔ اخلاق حسین۔" ارمغان ادب" سب رس کا تمثیلی انداز ۔ایک جائزہ اردو پبلشرز لکھنؤ ۱۹۷۴ء

عبادت بریلوی (ڈاکٹر) " مقدمات عبدالحق " قطب مشتری اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۷۳ء

" " " " " " " (سب رس) " " "

عبدالحق مولوی (ڈاکٹر) " قدیم اردو " سب رس انجمن ترقی اردو کراچی ۱۹۶۱ء

عبداللہ ، سید ، ڈاکٹر ۔ " وجہی سے عبدالحق تک " سب رس چمن بکڈپو سنہ ندارد

غلام عمر خاں (ڈاکٹر) " مجلہ تحقیقات اردو " ۔وجہی از محمد علی اثر حیدر آباد ۱۹۸۰ء

فرزانہ بیگم (ڈاکٹر) "دکنی کی نثری داستانیں" سب رس حیدر آباد ۔ ۱۹۸۴ء

فرمان فتح پوری (ڈاکٹر) " اردو کی منظوم داستانیں " قطب مشتری ۔انجمن ترقی اردو کراچی ۱۹۷۱ء

فہمیدہ بیگم (ڈاکٹر) فکر و ادب مثنوی نمبر۔ (قطب مشتری از م۔ن سعید)

شعبہ اردو بنگلور یونیورسٹی بنگلور ۱۹۸۰ء

قیوم صادق (ڈاکٹر) " دکنی ادب" ۔ وجہی کرناٹک ادبی سرکل بنگلور ۔ ۱۹۸۸ء

محمود شیرانی۔ سب رس ایک مطالعہ " دکنی اردو" مرتبہ عبدالستار دلوی ۔بمبئی یونیورسٹی ۔ ۱۹۸۷ء

منظر اعظمی (ڈاکٹر) " اردو میں تمثیل نگاری" سب رس ۔انجمن ترقی اردو دہلی ۱۹۷۷ء

ناز صدیقی ۔" انداز بیان " وجہی کا اسلوب اقبال پبلیکشنز حیدر آباد ۱۹۷۶ء

نصیر الدین ہاشمی ۔ "مقالات ہاشمی " ۔ وجہی بحیثیت مرثیہ گو تاج کمپنی لاہور ۱۹۳۹ء

۴ : وجہی اور اس کے فن کے متعلق مضامین (رسائل میں)

اثر محمد علی (ڈاکٹر) کتابیات وجہی ۔ سب رس کراچی ۔ جولائی ۔ ۱۹۸۹ء

اختر، نورالسعید (ڈاکٹر) تاج الحقائق کا مصنف۔ نوائے ادب بمبئی۔ اکتوبر ۱۹۶۸ء
〃 〃 〃 تاج الحقائق کا فنی تجزیہ سب رس حیدرآباد اگست ۱۹۶۹ء
〃 〃 〃 تاج الحقائق۔ محققین کی نظر میں 〃 فروری ۱۹۷۰ء
〃 〃 〃 وجہی بحیثیت صوفی 〃 〃 مارچ ۱۹۷۰ء
اختر، نورالسعید (ڈاکٹر) تاج الحقائق کی زبان۔ سب رس حیدرآباد۔ جنوری ۱۹۷۱ء
〃 〃 〃 وجہی کی دکنی شاعری۔ 〃 〃 مئی ۱۹۷۰ء
اختر اریوی ۔ وجہی کا نظریہ فن و نقد فن ۔ علی گڑھ میگزین۔ علی گڑھ۔ ۱۹۵۹ء
اختر حسن ۔ ملا وجہی کے بارے میں نئی معلومات۔ سب رس۔ حیدرآباد۔ جنوری فروری ۱۹۶۲ء
آزاد، نصیر الدین شماخوف۔ سب رس میں عربی و فارسی الفاظ۔ سب رس حیدرآباد۔ ستمبر ۱۹۵۶ء
اکبر الدین صدیقی محمد۔ میٹھے بچن سناؤں (وجہی کی غزل) سب رس حیدرآباد مارچ ۱۹۶۶ء
〃 〃 تبرکات وجہی۔ سب رس حیدرآباد۔ اپریل ۱۹۷۱ء
انصار اللہ نظر، محمد (ڈاکٹر) عوامی معاصر وجہی۔ سب رس حیدرآباد۔ مئی ۱۹۸۶ء
جاوید وششٹ (ڈاکٹر) وجہی پر سرقہ کا الزام بے بنیاد ہے۔ نوائے ادب بمبئی جنوری ۱۹۷۰ء
〃 〃 〃 وجہی صوفی یا شاہد باز۔ سب رس حیدرآباد آزادی۔ جنوری ۱۹۷۱ء
〃 〃 〃 قطب مشتری۔ تعمیر ہریانہ (یوم آزادی نمبر) اگست ۱۹۸۴ء
〃 〃 〃 سب رس کا دیباچہ " اکادمی " دو ماہی لکھنو۔ جولائی ۱۹۸۱ء
ذکا صدیقی 〃 سب رس ایک مطالعہ " آج کل دہلی نومبر ۱۹۶۳ء
زور محی الدین قادری (ڈاکٹر) سب رس۔ مکتبہ حیدرآباد۔ جنوری ۱۹۳۸ء
〃 〃 〃 گولکنڈہ کا ایک ادبی شاہکار (قطب مشتری) مجلہ مکتبہ اپریل ۱۹۲۹ء
زینت ساجدہ ۔ وجہی کی سب رس۔ سب رس حیدرآباد ستمبر ۱۹۴۵ء
سخاوت مرزا ۔ سب رس میراجی شمس العشاق (وجہی) النور حیدرآباد شمارہ ۶ جلد ۲ ۱۳۴۳ھ
〃 〃 وجہی کی ایک غیر مطبوعہ غزل۔ اردو کراچی اپریل ۱۹۵۴ء

سعید۔ م۔ ن۔ طوطی نامہ اور سب رس ۔ سب رس حیدرآباد۔ جنوری ۱۹۳۹ء
سعیدہ بیگم ۔ وجہی ۔ مجلہ عثمانیہ ۔ جلد ۱۰۔ شمارہ ۴۳ ۔ ۱۹۳۷ء
" " ضمیمہ قطب مشتری ۔ نوائے ادب بمبئی ۔ جنوری ۱۹٦۷ء
شیریں باسط (ڈاکٹر) قطب مشتری میں کردار نگاری ۔ جامعہ دہلی اگست ۱۹۸۴ء
طیب انصاری ۔ سب رس ۔ سب رس حیدرآباد۔ جون ۱۹٦٦ء
عبدالحق مولوی ۔ سب رس ۔ اردو انجمن ترقی اردو اورنگ آباد اکتوبر ۱۹۲۴ء
عزیز احمد ۔ سب رس کے ماخذ و مماثلات ۔ اردو اکتوبر ۱۹۵۰ء
قدرت نقوی ۔ سب رس میں تدوینی فرو گذاشت ۔ سب رس کراچی ۔ جون ۱۹۸۹ء
" سب رس میں ایک دوہا ۔ کتاب نما ۔ مارچ ۱۹۹۰ء
گرناتھ راج دیویکر ۔ قطب مشتری میں گجراتی اور مراٹھی الفاظ ۔ نوائے ادب بمبئی اپریل ۱۹۵۲ء
محمد معین الدین ۔ وجہی اور نشاطی کے اسالیب کا موازنہ ۔ سب رس حیدرآباد ۔ مئی ۱۹۴٦ء
محمود شیرانی پروفیسر ۔ سب رس ۔ اورینٹل کالج میگزین لاہور ۔ نومبر ۱۹۳۴ء
ریاض الدین محمد ۔ قطب مشتری ۔ آج کل دہلی جون ۱۹۵۹ء
مغنی تبسم (ڈاکٹر) ۔ وجہی کا اسلوب بیان ۔ سب رس حیدرآباد نومبر ۱۹۸٦ء
" " " وجہی کا شعور زیست ۔ سب رس حیدرآباد مارچ ۱۹۷٦ء
" " " " " " " " مارچ ۱۹۸۷ء
ممتاز احمد ۔ سب رس ایک طبع زاد تصنیف ۔ ساقی اگست ۱۹۵٦ء
منظر اعظمی (ڈاکٹر) سب رس کا تنقیدی جائزہ ۔ ہماری زبان دہلی اکتوبر ۱۹۷٦ء
ناز صدیقی ۔ وجہی کا اسلوب ۔ سب رس حیدرآباد ۔ فروری ۱۹۷٦ء
یعقوب عامر (ڈاکٹر) معرکہ وجہی غواصی ۔ فکر و تحقیق ۔ ترقی اردو بیورو ۔ جلد ۱ شمارہ ۱ ۱۹۸۹ء

۵ ۔ انتخاب نظم و نثر

جاوید وششٹ (ڈاکٹر) وجہی کے انشائیے ۔ بک سروس دہلی ۔ ۱۹۷۲ء

جاوید وششٹ (ڈاکٹر) رقصہ حسن و دل۔ اعتقاد پبلشنگ ہاوس دہلی۔ ۱۹۶۵ء
رفیعہ سلطانہ (ڈاکٹر) دکنی نثر پارے (سب رس) ساہتیہ اکیڈیمی حیدرآباد ۱۹۶۷ء
سیدہ جعفر (ڈاکٹر) دکنی نثر کا انتخاب (سب رس) ترقی اردو بیورو دہلی ۱۹۸۳ء
غلام عمر خاں (ڈاکٹر) قدیم اردو شاعری (قطب مشتری) شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ ۱۹۸۰ء
ہاشمی نورالحسن (ڈاکٹر) انتخاب سب رس۔ اترپردیش اردو اکیڈمی لکھنو۔

۶۔ پی ایچ۔ ڈی کے مقالے

جاوید وششٹ (ڈاکٹر)۔ ملا وجہی حیات اور کارنامے۔ جامعہ ملیہ دہلی
عبدالقدوس۔ ملا وجہی اور ان کی فارسی علمیت۔ بمبئی یونیورسٹی۔ ۱۹۷۷ء
مارگریٹ کیری کور سب رس۔ پیرس یونیورسٹی ۱۹۸۴ء

۷۔ ایم۔ اے۔ کا مقالہ

اقبال النساء۔ قطب مشتری کا تنقیدی مطالعہ۔ جامعہ گلبرگہ۔ ۱۹۹۲ء
(مطبوعہ سب رس۔ کراچی۔ جولائی ۱۹۸۹ء)

محمد قلی قطب شاہ
(کتابیات)

ابوالمظفر سلطان محمد قلی قطب شاہ، ابراہیم قطب شاہ (۱۵۸۰-۱۵۵۰ء) کا تیسرا فرزند اور مملکت گولکنڈہ کا پانچواں فرماں روا تھا۔ وہ ۱۴ ر رمضان ۹۷۳ھ مطابق ۱۴ ر اپریل ۱۵۶۵ء کو گولکنڈہ میں پیدا ہوا۔ اس کی ولادت کے موقع پر گولکنڈہ میں کئی دن تک جشن منائے گئے اور غریبوں، مسکینوں اور فقیروں کو انعام و اکرام اور خلعت سے نوازا گیا۔ "ماہ نامہ" کے مصنف کا بیان ہے کہ اس کی ماں "بھاگ وتی" یا "بھاگ رتی" ایک ہندو خاتون تھی۔ محمد قلی قطب شاہ کی تخت نشینی پندرہ سال کی عمر میں ۹۸۸ھ / ۱۵۸۰ء میں عمل میں آئی۔ اس کو بادشاہ بنانے میں دربار کے ہندو امیروں خصوصاً رائے راؤ کو بڑا دخل تھا۔ محمد قلی نے کم و بیش اکتیس برس تک نہایت تزک و احتشام کے ساتھ حکومت کی اور سینتالیس سال کی عمر میں ۱۰۲۰ھ / ۱۶۱۱ء میں انتقال کیا۔

محمد قلی قطب شاہ کو خوش قسمتی سے ایک مستحکم اور طاقت ور حکومت اپنے

باپ سے ورثے میں ملی تھی۔ اس کا دورِ حکومت دو ایک معمولی لڑائیوں کو چھوڑ کر بڑی حد تک امن و امان میں گذرا۔ یہ ضرور ہے کہ اندرون ملک اس کے مخالفین کے گروہوں نے وقتاً فوقتاً سازشیں کیں اور کبھی کبھی ہنگامے بھی کھڑے کیے لیکن محمد قلی کو انھیں کچلنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ محمد قلی کی سخاوت اور کشادہ دلی کا تذکرہ سبھی موّرخین نے کیا ہے۔ تخت نشین ہوتے ہی اس نے اپنے دربار کے امیروں، فوجی افسروں، شاعروں اور اہلِ کمال کو بلاتفریقِ مذہب و ملت بڑے بڑے انعامات اور اعزازات عطا کیے۔ اس کے دورِ حکومت میں ایران کے مشہور عالم میر محمد مومن حیدرآباد آئے ہوئے تھے، جنھیں بادشاہ نے اپنا مشیر مقرر کیا تھا۔ سلطنت کے بیشتر کاروبار کی عام نگرانی میر محمد مومن ہی کے سپرد تھی۔ یہی سبب تھا کہ محمد قلی کو سیاسی فکروں سے بے نیاز رہ کر عیش و عشرت کی زندگی گذارنے کا موقع مل گیا۔

محمد قلی کی تعلیم و تربیت اپنے دو بڑے بھائیوں کے مقابلے میں ادھوری اور ناقص ہوئی تھی۔ شاید اسی لیے نوجوانی کے زمانے میں وہ خود سر بلکہ آوارہ مزاج ہو گیا تھا۔ موّرخین نے اِس واقعہ کی تفصیل تاریخوں میں لکھی ہے کہ کس طرح لڑکپن میں ایک بار جب کہ موسیٰ ندی میں طغیانی آئی ہوئی تھی، محمد قلی نے اپنی جان کو ہلاکت میں ڈال کر گھوڑے پر ندی کو پار کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اسی واقعہ کے بعد ابراہیم قطب شاہ نے موسیٰ ندی پر وہ پل تعمیر کروایا تھا جو "پرانا پل" کے نام سے آج بھی مشہور ہے۔

محمد قلی قطب شاہ کے عہد کا ایک یادگار کارنامہ شہر حیدرآباد کا قیام ہے۔

محمد قلی کی بلند خیالی ایک وسیع، منصوبہ بند اور متمدن شہر کی طلبگار تھی۔ اس زمانے میں قلعہ گولکنڈہ کے اطراف آبادی بے ہنگم طور پر پھیلتی جا رہی تھی۔ آبادی کی ضروریات کے لحاظ سے یہ شہر ناکافی تھا۔ چناں چہ محمد قلی نے شہر گولکنڈہ کے قریب ایک وسیع اور منصوبہ بند شہر کی تعمیر کا بیڑہ اٹھایا۔ چار مینار اس شہر کا مرکزی مقام قرار پایا۔ اس کے اطراف چاروں جانب سیدھی سڑکیں بنائی گئیں اور قرب و جوار

میں شاہی محل تعمیر کروائے گئے۔ محمد قلی نے شہر کے قیام کے ساتھ اس بات کا بطور لحاظ رکھا کہ اس میں ایک متمدن زندگی کی تمام ضرورتیں موجود ہوں۔ چناں چہ اس شہر میں بے شمار بازار، خانقاہیں، مدرسے، مسجدیں، لنگر خانے، مہمان خانے اور کاروان سرائیں وغیرہ بنائی گئیں۔ ان عمارتوں کی تعداد کوئی بارہ ہزار بتائی جاتی ہے

تمدن اور سماجی نقطۂ نظر سے محمد قلی کا عہدِ حکومت، دکن کی تاریخ میں ایک یادگار دَور سمجھا جاتا ہے۔ محمد قلی نے اس بات کی خاص طور پر کوشش کی کہ اس مملکت میں بسنے والے مختلف فرقوں اور طبقوں کے درمیان یگانگت، میل جول اور بھائی چارگی کے جذبات نشو نما پائیں۔ محمد قلی کی ماں (بھاگ رتی) تلنگانہ کی ایک خاتون تھی، کوئی تعجب نہیں کہ محمد قلی کے مزاج کی تشکیل میں اس کی ماں کا اثر بھی کارفرما رہا ہو۔ اس نے اس امر کی بھی کوشش کی کہ مملکت میں بسنے والے سارے طبقات کو مذہبی آزادی حاصل رہے۔ دیوالی، بسنت اور ہولی کے تہوار قومی تقریبوں کے طور پر منائے جاتے تھے۔ یہ روایت تلنگانہ اور حیدر آباد کے عوام میں آج بھی رائج ہے۔ محمد قلی قطب شاہ اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر ہے۔ جس کا کلام عہدِ قدیم ہی میں مرتب ہو چکا تھا۔ سلطان محمد قطب شاہ نے جو رشتے میں اس کا بھتیجا اور داماد بھی ہوتا ہے، محمد قلی کے کلیات کو مرتب کر کے ۱۰۲۵ھ/۱۶۱۶ء میں اس پر ایک طویل منظوم مقدمہ بھی تحریر کیا تھا۔ ڈاکٹر زور نے اپنے مرتبہ کلیات میں اس مقدمے کے (۲۷) اشعار درج کیے ہیں۔ سلطان محمد قطب شاہ کا بیان ہے کہ محمد قلی نے پچاس ہزار شعر کہے ہیں۔ ~~ ۵

مگر شہ کہے شعر پچاس ہزار
دھرے وصف ایس سوکہن بہت عار

سلطان محمد قلی نہ صرف ایک خوبصورت شہر کا بانی، رعایا پرور حکمراں، دکنی تہذیب و تمدن کا معمار اور فنونِ لطیفہ کا دلدادہ تھا بلکہ اردو، تلگو اور فارسی کا ایک خوش گو شاعر بھی تھا۔ اسے اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر بننے کا

اعزاز بھی حاصل ہے۔ محمد قلی کا کلام چار سو سال پہلے کی ایک سماجی تہذیبی اور ادبی دستاویز بھی ہے۔ اس کے کلام کے مطالعہ سے قطب شاہی عہد کی سماجی اور ثقافتی زندگی کے متعلق بہت کچھ مواد حاصل کیا جاسکتا ہے۔ شادی بیاہ کے رسوم، مختلف موسموں، عیدوں، تہواروں اور کھیلوں کی تفصیلات کے دلچسپ مرقعے اس کی شاعری میں جا بجا بکھرے ہوئے ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے اگر یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ محمد قلی کی شاعری نہ صرف اس کی منظوم سوانح حیات ہے بلکہ اپنے دَور کی ایک مستند تاریخ بھی ہے، جس میں چار سو سال پہلے کی زندگی کی تصویریں ملتی ہیں۔

محمد قلی، ہندوستانیت کا بہت بڑا پرستار تھا۔ اس کی رگ و پے میں ہندوستانی تہذیب سرائیت کر گئی تھی۔ وہ ہندوستان کی ہر نمایاں اور مشہور رسم، ریت اور وضع قطع کو اپنے خیالات میں بسا لینا چاہتا تھا۔ یہاں اس امر کا انکشاف دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اس نے اپنے آبا و اجداد کی روش سے ہٹ کر دکنی وضع قطع اور لباس اختیار کیا تھا۔ قطب شاہی سلاطین میں وہ پہلا حکمراں تھا جس نے داڑھی کے بجائے مونچھ رکھی۔ ہندوؤں کی طرح کاندھے پر کپڑا اوڑھا اور ایرانی طرز کے قاقم و سنجاب کے گرم پیچوں، شملوں اور عماموں کی جگہ دیسی ململ کے سادہ کپڑے زیب تن کیے۔

محمد قلی کے کلام میں نہ صرف ہندوستانی عیدوں، تہواروں، موسموں، مناظرِ قدرت، پھلوں پھولوں، پرندوں، کھیلوں وغیرہ کی مکمل ترجمانی ملتی ہے بلکہ ہندوستانی عوام کے طور طریقے، رسومات، معتقدات اور توہمات کی عکاسی بھی ملتی ہے۔ اگر قطب شاہی عہد کی تہذیب کے نقوش دیکھنے ہوں یا اس عہد کے لوگوں کے جذبات و تصورات کا مطالعہ کرنا ہو تو محمد قلی کا کلام ہماری بھرپور رہنمائی کرے گا۔

اقبال بلگرامی ۔ زاویے ۔ اردو غزل قطب شاہ سے میر تک ۔ اورنگ آباد ۱۹۷۴ء
امیر اللہ شاہین ڈاکٹر ۔ تخلیق و تنقید ۔ محمد قلی اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر
ماڈرن پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۸۶ء
〃 〃 تخلیق و تنقید ۔ محمد قلی اور مذہبی رواداری
ماڈرن پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۸۶ء
زور محی الدین قادری ڈاکٹر ۔ ادبی تحریریں ۔ ہندوستان محمد قلی کی نظر میں
ادارہ ادبیات اردو حیدر آباد ۱۹۶۳ء
عبدالحق مولوی ۔ قدیم اردو ۔ کلیات محمد قلی ۔ انجمن ترقی اردو کراچی ۱۹۶۱ء
عبدالستار دلوی ڈاکٹر (مرتبہ) دکنی اردو ۔ محمد قلی کی شاعری کا تہذیبی پہلو از
ڈاکٹر سیدہ جعفر بمبئی ۱۹۸۷ء
طیب انصاری ۔ تحریر و تنقید ۔ معانی جدید رجحانات کی روشنی میں
حیدر آباد ۱۹۶۹ء
قیوم صادق ڈاکٹر ۔ دکنی ادب ۔ محمد قلی قطب شاہ کرناٹک ادبی سرکل گلبرگہ ۱۹۸۸ء
ملنسار احمد ۔ حرف الکتاب ۔ محمد قلی کی شاعری میں قومی یکجہتی کے عناصر بنگلور ۱۹۸۱ء

۵ ۔ محمد قلی اور اس کی شاعری سے متعلق مضامین (رسائل میں)

آصفیہ خلیل ۔ محمد قلی کے کلام پر ایک نظر ۔ نوائے ادب بمبئی اکتوبر ۱۹۶۴ء
آمنہ انصاری ۔ قلی قطب شاہ کا پیا نگر ۔ سب رس حیدرآباد مارچ ۱۹۷۸ء
اثر محمد علی ڈاکٹر محمد قلی ایک جائزہ سب رس حیدرآباد جنوری ۱۹۷۵ء
〃 〃 محمد قلی کی غزل 〃 مارچ اپریل ۱۹۸۶ء
〃 〃 محمد قلی کی غزل گوئی ذوق نظر حیدرآباد اپریل ۱۹۸۷ء
احمد جلیس تہذیب کا معمار ۔ محمد قلی سب رس حیدرآباد اپریل ۱۹۶۵ء
اکبر الدین صدیقی ' محمد ۔ کلام محمد قلی پر ایک نظر سب رس حیدرآباد مارچ ۱۹۶۱ء

برالدین صدیقی محمد ۔ کلام محمد قلی پر ایک نظر ۔ سب رس حیدرآباد۔ مارچ ۱۹۶۱ء
" " محمد قلی کی شاعری " " فروری ۱۹۶۴ء
نیس قیوم فیاض " " " مارچ ۱۹۷۷ء
" مرا شہر لوگاں سوں معمور کر " " مارچ ۱۹۷۶ء
بلگرامی، سید علی ۔ سلطان محمد قلی " " اپریل ۱۹۶۶ء
تاج سلطانہ مقبرۂ محمد قلی قطب شاہ " " مئی ۱۹۵۸ء
ثمینہ شوکت ڈاکٹر ۔ محمد قلی قطب شاہ ۔ سب رس حیدرآباد ۔ جون ۱۹۷۲ء
جاوید وششٹ ڈاکٹر ۔ محمد قلی کا رنگ تغزل ۔ سب رس حیدرآباد ۔ اپریل ۱۹۶۶ء
" " " محمد قلی اور نبی کا صدقہ۔ ہمایوں دہلی (سالنامہ) ۱۹۶۹ء
" " " گولکنڈہ کی عید ۔ عہد محمد قلی میں گگن بمبئی اگست ۱۹۷۷ء
جمیل نقوی قطب معانی ۔ ماہِ نو کراچی ۔ اگست ۱۹۶۲ء
راجندر پرشاد محمد قلی قطب شاہ کا اتاثہ سب رس حیدرآباد مئی ۱۹۸۹ء
رحیم الدین کمال ڈاکٹر محمد قلی کی شخصیت اور عہد کا تجزیاتی مطالعہ ۔ سب رس، حیدرآباد ۱۹۸۹ء
رفعت، مبارزالدین ۔ عطائی۔ عہد محمد قلی کا ایک گمنام شاعر ۔ سب رس حیدرآباد
اپریل ۱۹۶۲ء
رشید ارشد ۔ معانی کی شاعری پر ناقدانہ نظر۔ سب رس حیدرآباد مارچ ۱۹۷۸ء
زاہدہ ابوالحسن ۔ محمد قلی کی شاعری۔ سب رس حیدرآباد۔ جولائی ۱۹۳۹ء
زور، محی الدین قادری ڈاکٹر ۔ محمد قلی کی بارہ پیاریاں۔ سب رس حیدرآباد۔ جولائی ۱۹۳۹ء
" " سلطان محمد قلی قطب شاہ اور تصوف مجلہ نقش اویس
ورنگل کالج جنوری ۱۹۴۰ء
" " ہندوستان محمد قلی کی نظر میں ۔ سب رس حیدرآباد مارچ ۱۹۷۸ء

زورؔ محی الدین قادری ڈاکٹر ۔ حیدرآباد جیسا کہ محمد قلی قطب شاہ نے تعمیر کیا (انگریزی)
〃 〃 〃 〃 سب رس ۔ حیدرآباد ۔ اپریل تا جون ۱۹۶۸ء
〃 〃 〃 بھاگ متی اور بھاگ نگر ۔ سب رس حیدرآباد ۔ جون ۱۹۵۸ء
〃 〃 〃 محمد قلی قطب شاہ کی شاعری 〃 〃 جنوری ۱۹۶۳ء
زینت ساجدہ ڈاکٹر ۔ محمد قلی اور اس کی شاعری ۔ سب رس حیدرآباد اپریل ۱۹۵۸ء
〃 〃 〃 حیدرآباد کے ادیب جلد اول ساہتیہ اکیڈمی حیدرآباد
محمد قلی قطب شاہ کی شاعری از ڈاکٹر زور ۱۹۵۸ء
سراج الدین سید پروفیسر دکن دیس، دکنی بھاشا اور محمد قلی قطب شاہ
سب رس ۔ حیدرآباد مارچ ۱۹۷۸ء
سراج الدین علی خاں محمد قلی کا ایک غیر مطبوعہ فرمان ۔ سب رس حیدرآباد جون ۱۹۵۸ء
سید محمد محمد قلی اور علی برید سب رس حیدرآباد فروری ۱۹۶۴ء
〃 محمد قلی قطب شاہ 〃 〃 〃 〃
〃 محمد قلی کا تمدن 〃 〃 اپریل ۱۹۶۵ء
سیدہ جعفر ڈاکٹر دکنی تہذیب اور محمد قلی قومی آواز نومبر ۱۹۷۷ء
〃 〃 محمد قلی کی شاعری سب رس حیدرآباد مارچ ۱۹۷۸ء
〃 〃 محمد قلی کی شاعری کا تہذیبی پہلو ۔ سب رس کراچی جنوری ۱۹۸۹ء
شاہدؔ، خواجہ حمید الدین سلطان محمد قلی قطب شاہ ۔ سب رس حیدرآباد جون ۱۹۵۸ء
〃 〃 محمد قلی کی گنگا جمنی شاعری 〃 جنوری ۱۹۶۲ء
شفیق النساء محمد قلی ۔ شخصیت اور فن ۔ سب رس حیدرآباد جنوری ۱۹۶۲ء
شکیل احمد، شاہ ڈاکٹر محمد قلی قطب شاہ ۔ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر
آہنگ گیا ۔ جون ۱۹۷۷ء
شکیب ضیاء الدین احمد ڈاکٹر ۔ محمد قلی کی غزل سب رس حیدرآباد ۔ اپریل ۱۹۶۵ء

صغرا ماہر ۔ محمد قلی قطب شاہ " " جولائی اگست ۱۹۴۶ء

حبیب انصاری ڈاکٹر معانی جدید رجحانات میں ۔ سب رس حیدر آباد مارچ ۱۹۶۶ء

عبدالستار دلوی ڈاکٹر دکنی اردو ۔ محمد قلی کی شاعری کا تہذیبی پہلو از سیدہ جعفر ۔ بمبئی ۱۹۸۷ء

عبدالحفیظ صدیقی ۔ محمد قلی قطب شاہ ۔ سب رس حیدر آباد (مرقع دکن نمبر)

جنوری ۱۹۳۹ء

عبدالحق مولوی محمد قلی قطب شاہ " " جنوری ۱۹۶۲ء

" کلیات محمد قلی (جز دوم) اردو اورنگ آباد جنوری ۱۹۲۲ء

عبدالرحمان ہاشمی قاضی ۔ محمد قلی کے کلام کی ادبی اہمیت ۔ سب رس

حیدر آباد جولائی ۱۹۷۱ء

عزت النساء سیدہ محمد قلی ۔ بحیثیت مرثیہ نگار ۔ سب رس حیدر آباد دسمبر ۱۹۷۷ء

عقیل ہاشمی ڈاکٹر محمد قلی کی شاعری کا سماجی پہلو " " اپریل ۱۹۸۴ء

" محمد قلی قطب شاہ قومی یکجہتی کا علمبردار " " ستمبر ۱۹۸۹ء

غلام ربانی معتبرۂ محمد قلی قطب شاہ ۔ سب رس حیدر آباد ۱۹۵۸ء

غلام یزدانی سلطان محمد قلی قطب شاہ " " ۱۹۵۸ء

غلام یزدانی مولوی سید ۔ کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ (جز اول) اردو اورنگ آباد

جنوری ۱۹۲۲ء

قادر علی محمد قلی اور نظیر سب رس حیدر آباد نومبر ۱۹۷۱ء

" " " " دسمبر ۱۹۷۱ء

" " " " جنوری ۱۹۷۲ء

کرشنا سوامی مدراج محمد قلی اور دکنی تمدن " " اپریل ۱۹۶۶ء

" بھاگ متی اور محمد قلی " " جون ۱۹۵۸ء

" دکن کا ایک اولوالعزم سلطان " " جون ۱۹۵۸ء

کوکب قدر ۔	محمد قلی قطب شاہ اور واجد علی شاہ ۔ آج کل دہلی	جنوری ۱۹۸۴ء
گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر	محمد قلی قطب شاہ " "	جنوری ۱۹۷۱ء
مجید بیدار ڈاکٹر	کلام معانی کا لسانی مطالعہ۔ سب رس حیدرآباد	مارچ ۱۹۷۷ء
محمد قدیر آبادی	گولکنڈہ کا پہلا شاعر بادشاہ ۔عالمگیر (عید نمبر)	۱۳۴۹ء
محمد یوسف احمد	محمد قلی کی ادبی خدمات ۔ سب رس حیدرآباد	جنوری ۱۹۶۰ء
مسعود حسین خاں ڈاکٹر	محمد قلی کی زبان سب رس حیدرآباد	فروری ۱۹۶۴ء
"	سلطان محمد قلی قطب شاہ " "	دسمبر ۱۹۴۲ء
مسیح الزماں ڈاکٹر	محمد قلی کی مرثیہ نگاری کا تہذیبی پس منظر سب رس حیدرآباد	اپریل ۱۹۶۶ء
معین الدین محمد	محمد قلی اور رومانیت ۔ سب رس حیدرآباد ۔	جنوری ۱۹۴۶ء
میراجی	سلطان محمد قلی قطب شاہ ۔ سب رس حیدرآباد	جون ۱۹۴۱ء
میر حسن	کلام محمد قلی کے محرکات " "	اپریل ۱۹۶۵ء
میمونہ بانو ڈاکٹر	محمد قلی قطب شاہ بحیثیت شاعر ۔ (اساونیر) کالج آف لینگویجس حیدرآباد ۔	اگسٹ ۱۹۷۵ء
"	محمد قلی بحیثیت شاعر ۔ سب رس حیدرآباد	فروری ۱۹۷۸ء
نصیر الدین ہاشمی	محمد قلی کے عوامی کارنامے ۔ سب رس حیدرآباد ۔	فروری ۱۹۶۴ء
نصیر الدین ہاشمی	محمد قلی کی منظر نگاری ۔ شہاب	دسمبر ۱۹۴۲ء
نظام الدین مغربی	محمد قلی قطب شاہ کے چند حالی ہم عصر سب رس حیدرآباد	اگست ۱۹۸۵
وقار خلیل	محمد قلی قطب شاہ ۔ سب رس حیدرآباد ۔	اپریل ۱۹۷۹ء
"	حیات محمد قلی قطب شاہ ۔ ذوق نظر ۔ حیدرآباد ۔	اپریل ۱۹۸۷ء

۶۔ منظومات :

آغا فرخ شیرازی	محمد قلی قطب شاہ ۔ ذی شان سب رس حیدرآباد ۔	اپریل ۱۹۶۵ء ۔

مصنف	عنوان	رسالہ	تاریخ
ز امانت خانی -	محمد قلی قطب شاہ -	سب رس حیدرآباد	مارچ ۱۹۸۸ء
طاہرہ سعید ڈاکٹر	نوائے محمد قلی قطب شاہ	سب رس حیدرآباد	اپریل ۱۹۶۵ء
"	محمد قلی کا پیام عوام کے نام	" "	مارچ ۱۹۸۸ء
"	محمد قلی کے نام	" "	اپریل ۱۹۷۲ء
"	نوائے محمد قلی	" "	مئی ۱۹۸۸ء
ع قریشی	سلطان محمد قلی قطب شاہ	" "	اپریل ۱۹۶۵ء
ن جامی	نذر محمد قلی قطب شاہ	" "	دسمبر ۱۹۸۳ء
عد حسین سعد	سلطان محمد قلی قطب شاہ	سب رس حیدرآباد -	اگست ۱۹۸۵ء
ید جلالی	محمد قلی قطب شاہ کی یادیں	" "	اپریل ۱۹۷۲ء
لیمان اطہر جاوید ڈاکٹر	محمد قلی قطب شاہ	ذوق نظر حیدرآباد -	اپریل ۱۹۸۷ء
سلاح الدین نیر	قطب شاہ کی زبانی	سب رس حیدرآباد -	اپریل ۱۹۶۶ء
العقار اسیر	محمد قلی قطب شاہ	سب رس حیدرآباد -	مئی ۱۹۸۸ء
سرور	نذر قطب شاہ	" "	مارچ ۱۹۷۸ء
آفندی	محمد قلی قطب شاہ	ذوق نظر حیدرآباد	اپریل ۱۹۸۷ء
ار خلیل	قطب اردو	سب رس حیدرآباد	اپریل ۱۹۶۶ء
توب عمر ڈاکٹر	محمد قلی کی غزل کا آزاد ترجمہ	ذوق نظر حیدرآباد	اپریل ۱۹۸۷ء

(مطبوعہ قومی زبان - کراچی - مارچ ۱۹۹۳ء)



اشاریہ

مرتبہ راحت سلطانہ

کتب

۲- اشخاص



ارتسامات

ڈاکٹر محمد علی اثر گذشتہ چند برسوں سے دکنی شعر و ادب کے میدان میں انہماک اور وقف شدگی کے ساتھ تحقیقی کام میں مصروف ہیں ۔ اِن کی بعض کتابوں کو اہم ماخذوں کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے ۔ پروفیسر غلام عمر خاں

" دکنی غزل کی نشو و نما " کی حیثیت چراغ رہ گذر کی سی ہے ' جس سے ہمارے علم میں اضافہ ہی نہیں ہوتا بلکہ تحقیق کی نئی راہیں بھی کھلتی ہیں ۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی

" آپ نے دکنی زبان و ادب کی تحقیق پر قابلِ قدر کام انجام دیا ہے ۔ آپ قابلِ مبارکباد ہیں کہ استاد محترم ڈاکٹر زور مرحوم کے نقش قدم پر چل رہے ہیں اور ان کے سچے جانشین بننے کا آپ ہی کو حق پہنچتا ہے ۔ پروفیسر خواجہ حمید الدین شاہد

جواں سال محققوں میں آپ سرِفہرست ہیں ۔ دکنی غزل پر آپ کا کام بے نظیر ہے " دکنی اور دکنیات " ہر وقت میری میز پر رکھی رہتی ہے کہ میں اسے حوالے کی کتاب کے طور پر استعمال کر رہا ہوں ۔ پروفیسر گیان چند

" اس دور میں جم کر کام کرنے والے انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں اور آپ کا نام
اس مختصر فہرست میں سرفہرست ہے "۔ ڈاکٹر جمیل جالبی

" دکنی غزل کی نشوونما " کے مطالعہ کے بغیر دکنی شاعری کی شناخت ادھوری اور
نامکمل رہے گی ۔ پروفیسر مغنی تبسم

" کچھ عجب نہیں کہ اردو تحقیق کے دبستانِ دکن کا یہ دور ڈاکٹر اثر کے نام اور
ان کی نمائندگی سے بھی موسوم ہو جائے ۔ ڈاکٹر معین الدین عقیل

دکنی ادب پر آپ نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں، وہ نہایت قیمتی اور مفید
ہیں خدائے پاک آپ کو صحت و عافیت کے ساتھ سلامت رکھے اور مزید کام کا موقع
اور طاقت عطا فرمائے۔ پروفیسر میر محمود حسین

" ڈاکٹر محمد علی اثر کی غیر معمولی محنت اور لگن کے باعث دکنی ادب کے نئے نئے گوشے
روشن ہو رہے ہیں " پروفیسر سلیمان اطہر جاوید

" دکنی اور دکنیات " کی ترتیب میں ڈاکٹر اثر نے غیر معمولی کاوش محنت اور حسن ترتیب
سے کام لیا ہے۔ اس علمی خدمت پر وہ مبارکباد کے مستحق ہیں ۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی

" محمد علی اثر نے دنیائے تحقیق میں اپنے کارناموں سے تہلکہ مچا دیا، آپ کی ریاضت
لگن اور انہماک نے آپ کو بہت جلد اس میدان کا شہسوار بنا دیا " علیم صبا نویدی

مصنف کے بارے میں

نام	:	محمد علی اثر
والد کا نام	:	حکیم شیخ محبوب
تاریخ پیدائش	:	۲۲ر دسمبر ۱۹۴۹ء
تعلیم	:	ایم۔اے۔ پی ایچ۔ڈی۔ مخطوطہ شناسی کا پوسٹ ایم۔اے ڈپلوما
ملازمت	:	ریڈر شعبۂ اردو، ویمنس کالج (جامعہ عثمانیہ) کوٹھی۔ حیدرآباد۔
رہائش	:	"کاشانۂ اثر" 9/226-4-20، محبوب چوک، حیدرآباد-۲

تصانیف

- غواصی شخصیت اور فن (تحقیق) ۱۹۷۷ء
- ملاقات (شعری مجموعہ) ۱۹۸۰ء
- شمع جلتی رہے (رپورتاژ) ۱۹۸۰ء
- دبستان گولکنڈہ، ادب اور کلچر (مرتبہ) ۱۹۸۱ء
- دکنی اور دکنیات (کتابیات) ۱۹۸۲ء
- دکنی اور دکنیات اسلام آباد ایڈیشن ۱۹۸۶ء
- تذکرہ مخطوطات (جلد ششم) ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد۔ بہ اشتراک محمد اکبرالدین صدیقی ۱۹۸۳
- دکنی غزل کی نشوونما (تحقیق) ۱۹۸۶ء
- دکنی کی تین مثنویاں (تحقیق و تدوین) ۱۹۸۷ء
- دکنی شاعری۔ تحقیق و تنقید۔ ۱۹۸۸ء
- کلیات ایمان۔ ترمیم و اضافہ (مرتبہ سیدہ ہاشمی) ۱۹۸۷ء
- نظیر شناسی۔ (بہ اشتراک پروفیسر اکبر علی بیگ) ۱۹۸۸ء
- حرفِ نم دیدہ (شعری مجموعہ) ۱۹۹۰ء
- تحقیقی نقوش (تحقیق) ۱۹۹۳ء
- خامہ در خامہ (علیم صبا نویدی کی غزل گوئی کا جائزہ) مرتبہ ۱۹۹۳ء
- جنوب کا شعر و ادب (علیم صبا نویدی کے تحقیقی مضامین) مرتبہ ۱۹۹۳ء

ہدیۂ تشکّر و امتنان



پروفیسر گیان چند جین

پروفیسر یوسف سرمست

پروفیسر وارث علوی

جناب مشفق خواجہ

اور

جناب علیم صبا نویدی

کی خدمت عالیہ میں

محمد علی اثر